خونی ہندوستان

مُرتّبہ

یکتا امروہوی

گہوارۂ ادب فیاض گنج۔ بہادر گڈھ روڈ دہلی

قیمت دو روپیہ

جمال پرنٹنگ پریس دہلی

اراکین انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کے
اُن افسانوں اور نظموں کا مجموعہ جو فرقہ وارانہ
فسادات کے سلسلہ میں لکھے گئے۔

۲

یکتا

"خونی ہے ہندوستان"



پروفیسر وجدی الحسینی



اے آر رشدی



اشتیاق عارف



صہبا لکھنوی



قمر جمالی



انجم سلمانی



عمران الارشد

"خونی ہے ہندوستان"



ابراہیم یوسف



علی تاج



اسد بھوپالی



عنبر چغتائی



جاوید



رئیس امروہوی

فہرست

مسٹر نسیم سندیلوی

بی اے (آنرز) ایم اے

مینیجنگ ڈائرکٹر "دی سائن ٹون لمیٹڈ" لکھنؤ کے نام

جو ادیب و صحافی کی حیثیت سے ایک نمایاں شخصیت کے
مالک ہیں اور آجکل اپنی پہلی پیش کش "سہاشید دُلھن" ۵
کی تیاریوں میں منہمک ہیں۔ لیکن اس انہماک کے،
باوجود ہندو مسلم فسادات کی خبریں سن کر جن کی آنکھوں
میں ہم نے سب سے پہلے آنسو دیکھے۔

یکتا

کیا فرماتے ہیں؟

آنریبل جے۔ این۔ منڈل۔ لا ممبر انٹریم گورنمنٹ

آنریبل۔ بی۔ جی۔ کھیر وزیر اعظم بمبئی

آنریبل گووند ولبھ پنت وزیر اعظم یوپی

ہز ایکسی لینسی لارڈ ویول گورنر جنرل آف انڈیا

مسٹر چرچل سابق وزیر اعظم برطانیہ

جارج برنارڈ شاہ

ہز ایکسی لینسی سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم حیدر آباد

مسٹر سید بشیر حسین زیدی وزیر اعظم رامپور

مولانا احمد سعید صدر جمعیتہ علماء ہند

مسٹر مقیم الدین فاروقی جنرل سکریٹری پراونشل کمیونسٹ پارٹی

مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ پی۔ سی۔ ایس

حضرت نیاز فتحپوری مدیر نگار

پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین زور۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

حضرت مولانا ارشد تھانوی

پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی۔ میسور یونیورسٹی

جناب احمد ندیم قاسمی مدیر "سویرا"
جناب شوکت تھانوی
جناب صمد شاہین مدیر "نیا دور"
جناب ساغر نظامی مدیر "ایشیا"
مسٹر پریم ناتھ پردیسی

آنریبل جے۔ این۔ منڈل لا ممبر انٹرم گورنمنٹ

ڈیر سر!

آنریبل مسٹر جے۔ این۔ منڈل کو آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ ایک کتاب موجودہ فسادات کے بارے میں اس اُمید سے شائع کر رہے ہیں کہ ملک میں فرقہ وارانہ یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو۔

یہ اطلاع آنریبل ممبر کی ہدایت پر آپ کو بھیجی جا رہی ہے۔

پرائیویٹ سکریٹری آنریبل ممبر

(ترجمہ)

آنریبل بی جی کھیر وزیر اعظم بمبئی

ڈیر سر!

۱۶ ماہِ رواں کا والا نامہ اور منسلکہ پوسٹر میں نے دیکھا میں آپ کے اور دیگر ترقی پسند مصنفین بھوپال کے اس خلوص وسعت نظر اور جدّ و جہد سے بہت متاثر ہوا جس کے باعث آپ اس عظیم الشان مقصد کے حصول کے لئے کوشش فرما رہے ہیں۔ اس سے زیادہ خوفناک اور عبرت خیز منظر اور کوئی نہیں کہ دھرتی کے یہ لال جنھیں ماحول، فطرت، اور وراثت نے ایکدوسرے کیساتھ رہنے اور کام کرنے پر مجبور کیا ہے۔ باہم دگر دست و گریباں ہو جائیں۔

ہمیں دنیا کو ایک آفاقی نظام کے رشتہ میں منسلک کر کے تمام نوع انسانی کو متحد کرنے کے مقاصد اپنے پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ باہمی نفرت کا یہ سیلاب ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے تباہ کن ہے ہمیں اس طوفان بلاخیز کو روکنے کے لئے ہر امکانی جدّ و جہد کرنی چاہئے ہمارے ادیبوں کا سب سے بڑا فرض یہ ہو کہ اس کرب، حزن اور بے چینی کو، نظم۔ ڈرامہ افسانہ۔ مقالہ، غرض ہر پیرایۂ بیان میں ظاہر کریں جن کے بوجھ سے ہماری روح دبی جا رہی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ جس قسم کا ادب آپ شائع کرنا چاہتے ہیں اس سے امن قائم ہو گا۔ نیز ہندوستان کے بسنے والے تمام لوگوں میں ایک دوسرے کا بھائی بھائی سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو گی۔

(ترجمہ)

آنریبل گووند ولبھ پنت وزیر اعظم یو۔پی

ڈیر سر!

وزیر اعظم کو آپ کا ۲۰؍ ماہ گذشتہ کا اطلاع نامہ ملا۔ یہ معلوم کر کے
لی مسرت ہوئی کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کو روکنے اور تعاون و یگانگت کی فضا پیدا
رنے کے لئے آپ جد و جہد فرما رہے ہیں۔ وزیر اعظم آپ کے ان خیالات سے بالکل
متفق ہیں کہ ہمارا ملک باہمی اتحاد اور رواداری کے بغیر مکمل آزادی اور قومی ترقی
مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔

پرائیویٹ سکریٹری وزیر اعظم یو۔پی

(ترجمہ)

ہزایکسی لینسی لارڈ ویول گورنر جنرل آف انڈیا

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مسٹر ویول نے ہندو مسلم اتحاد کی اپیل کرنے والی کتاب کے لئے رائے دینے سے معذوری کا کیوں اظہار کیا ؟ ممکن ہے آپ کچھ سمجھ سکیں۔ موصوف نے میرے خط کے جواب میں مندرجہ ذیل جواب روانہ کیا ہے۔

(یکتا)

ڈیر سر !

11

میں حضور وائسرائے بہادر کی ہدایت کے بموجب ہزایکسی لینسی جانب سے آپ کے خط مورخہ ۱۴ جنوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

افسوس ہے کہ حضور لارڈ ویول آپ کی کتاب کے لئے کوئی پیغام سال کرنے سے معذور رہیں۔

اسسٹنٹ سکریٹری ہزایکسی لینسی وائسرائے

(ترجمہ)

مسٹر چرچل ہندوستانی اور ہندوستانیوں کے لئے کیا جذبات رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس مکتوب سے کیا جا سکتا ہے۔ جو میرے اس خط کے جواب میں موصول ہوا ہے جس کے ذریعہ میں نے اس کتاب کے بارے میں صاحب موصوف سے رائے طلب کی تھی۔

(ایکتا)

مسٹر چرچل سابق وزیر اعظم برطانیہ

ڈیر سر! ۱۴

مسٹر چرچل کی جانب سے آپ کے خط محررہ ۱۴/ جنوری ۱۹۴۷ء کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مسٹر چرچل چاہتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں تحریر کیا جائے کہ وہ اس کتاب کے بارے میں کہ یہ طبع ہو یا نہ ہو۔ بالکل آپ پر چھوڑتے ہیں۔ وہ اپنی رائے کے اظہار کے لئے اس قدر فرمائشیں، اور دیگر متعدد اقسام کے مراسلات موصول کر رہے ہیں کہ وہ ان کو تاوقتیکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت ہی مخصوص نہ ہوں جواب نہیں دے سکتے۔

(ترجمہ)

جارج برنارڈشاہ سے راقم الحروف نے کتاب "خونی ہے ہندوستان" کے لئے پیغام کی خواہش کی تھی اور کتاب کی اہمیت کے پیش نظر پوسٹر روانہ کردیا تھا۔ صاحب موصوف کی طرف سے جو معصومانہ جواب موصول ہوا ہے۔ وہ صرف اس لئے درج ہے کہ شاہ کی معصومیت کا آپ کو اندازہ ہو جائے۔

(یکتا)

١٣

جارج برناڈشاہ

ڈیر سر!

چونکہ برناڈشاہ اس پوسٹر کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکے اس لئے وہ صرف اس کی خوش خطی کی داد دے سکتے ہیں۔

(ترجمہ)

ہز ایکسیلینسی سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم حیدرآباد دکن

ڈیر سر!

یمین السلطنت حضور صدر بہادر مملکت آصفیہ کی ہدایت کے بموجب
آپ کے ۱۴ ماہ رواں کے خط اور منسلکہ پوسٹر کی رسید سے مطلع کرتا ہوں۔ نیز ۱۴
یہ کہ موجودہ تلخ حالات میں اس قسم کی تحریک قابل مبارکباد ہے۔ اُمید ہے
موجودہ پراگندگی دور کرنے میں ایسے مجمعے قابل قدر حصّہ لیں گے۔

مرزا نجف علی خاں

ڈائرکٹر شعبہ اطلاعات

عالی مرتبت مسٹر سید بشیر حسین زیدی وزیر اعظم رامپور

یکتا صاحب۔

آپ نے "خونی ہندوستان" شائع کرکے بڑی قابلِ تعریف اور مستحقِ داد ہمت و جرأت سے کام لیا ہے۔ آجکل کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک عاقبت اندیش حصہ پاگلوں کی طرح گرد و پیش سے آنکھیں بند کر کے باہم دست و گریباں ہے اور اس کشمکش میں ننھی ننھی معصوم روحوں کو بھی بے دریغ اپنے پاؤں سے کچل رہا ہے۔ ایسے ہی تیز اور زہر میں بجھے ہوئے نشتروں کی ضرورت ہے۔ آپ کے وہ آنسو کبھی رائیگاں نہیں جا سکتے۔ جو دل کی گہرائیوں سے اُبل کر آنکھوں کے راستہ ٹپکے ہیں۔ ان کی نمکین تیزی اور پُرسوز چمک ان دیوانوں کی حماقت کا علاج بن کر رہے گی۔

میں آپ کو مُبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کی اس پُر خلوص کوشش کو خاطر خواہ بار آور کرے۔

۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء

سید بشیر حسین زیدی

مولینا احمد سعید صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند

ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد جس قدر ضروری ہے اس سے کوئی، سمجھدار اور ہوش مند انسان انکار نہیں کر سکتا۔ بالخصوص اس دور میں جبکہ بد قسمتی سے ہندو اور مسلمان غلط اور جاہ پرست لوگوں کی اغراض فاسدہ کے شکار ہو گئے ہیں اور ایک جاہلانہ رو میں بہے جا رہے ہیں۔ اس امر کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں تاکہ ملک میں امن اور خوش حالی پیدا ہو سکے۔

مجھے یہ معلوم کر کے مسرّت ہوئی۔ کہ ہمارے دوست یکتا امروہوی اس
سلسلہ میں کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں اور وہ کوئی ایسا مجموعہ تیار کر رہے 16
ہیں جس میں علاوہ ادبی چاشنی کے باہمی اتحاد کا بھی بہت کچھ سامان ہو گا۔ کسی ایسی تصنیف اور کسی اشعار کے ایسے مجموعہ کے متعلق کیا عرض کر سکتا ہوں۔ جو یکتا کی نگرانی میں جمع کیا جائے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ صرف یکتا امروہوی کا نام ہی اس ضمانت کے لئے کافی ہے کہ وہ کتاب مفید، بہتر اور ضروری ہوگی۔

فقیر احمد سعید

مسٹر مقیم الدین فاروقی جنرل سکریٹری پراونشل
کمیونسٹ پارٹی

یکتا صاحب!

آپ اور میں مختلف شکلوں میں ایک ہی کام کر رہے ہیں ——
بھائی بھائی کی لڑائی کو ختم کر کے ایک مشترک لڑائی کی بنیاد مضبوط کرنا میری پارٹی ۱۷
کا بھی کام ہے۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کے کام کی کیا تعریف کریں بات تو جب ہے، اور وہی اصل تعریف ہے، کہ آزادی پسند عوام، ہندو اور مسلمان، وہ کام کرنے لگیں جو آپ اور ہم کر رہے ہیں۔

بہر حال آپ اور بھوپال کے ترقی پسند مصنفین قابل مبارکباد ہیں۔ مشترک جد و جہد کے سپاہیوں کو ایک دوسرے کی ہمت بڑھانی چاہیئے تاکہ منزل کی طرف تیز گامی سے قدم اُٹھے۔

مقیم الدین فاروقی

مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب

مجھ سے ایک ایسی کتاب کے متعلق اظہار خیال کی خواہش کی گئی ہے۔ جس میں ایسے مضامین ہوں گے۔ جن سے ملک کے تمام فرقوں میں باہمی رواداری اور اتحاد کے جذبات پیدا ہوں۔

میرے نزدیک یہ ایک ایسا اہم کام ہے۔ جس کی طرف ملک کے دوسرے اہل قلم حضرات بھی اگر متوجہ ہو جائیں۔ تو نا اتفاقی اور عداوت کی موجودہ فضا پر بہت اچھا اثر پڑے۔

ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں ملک کی دوسری زبانوں خصوصاً ہندی میں بھی شائع کی جائیں۔

جمیل

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ بی۔سی۔ایس

اتحاد و اتفاق باہمی کے افادی پہلو پر روشنی ڈالنا آفتاب کا تعارف کرانا نہیں تو اور کیا ہے "آفتاب آمد دلیل آفتاب"! آفتاب اتحاد و اتفاق ہی در اصل عروج زندگی اور ارتقائے حیات کے دوسرے نام ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میرا تو یہ مقصدِ حیات رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ نفاقِ باہمی کی جگہ میثاق ملی اور افتراقِ قومی کی جگہ یکجہتی اور یگانگت لے لے۔ اور حقیقتاً یہی وہ شمع روشن ہے جس کی روشنی میں کاروانِ ملک و قوم غلامی و مجبوری کی ظلمتوں کو طے کر کے آزادی و فلاح کے چشمۂ حیات تک پہونچ سکتے ہیں۔ 19

میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ کوششیں مشکور ہوں گی اور آپ اس نادر مجموعہ سے ملکی ذہنیت میں ایک ضروری انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہوں گے!

حضرت نیاز فتحپوری مدیر "نگار"

ہندوستان کی نجات اور اس کے مستقبل کی عظمت صرف اس پر منحصر ہے کہ یہاں کی تمام قومیں سیاسی حیثیت سے ایک ہی شیرازہ سے وابستہ ہوں اور مذہبی حیثیت سے وہ ایک دوسرے کا احترام کریں۔

اس لئے جناب یکتا امروہوی کی یہ سعی اتحاد اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی کوشش ہے۔ قابل ستائش ہے اور ملک کا فرض ہے کہ وہ ان کی اس کوشش کو کامیاب بنانے میں پوری مدد کرے۔

نیاز فتحپوری

پروفیسر ڈاکٹر سیّد محی الدین زورؔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جنابِ مکرّم!

٢١ "خونی ہے ہندوستان" کے عنوان کے تحت آپ جو مجموعہ شائع کر رہے ہیں۔ وہ موجودہ حالات کے تحت بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس میں جن اصحاب کے مضامین اور نظمیں شریک ہیں۔ وہ بھی اُردو کے اچھّے اور متعارف لکھنے والے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہوگا اور آپ کی اس سعی کی خاطر خواہ قدر کی جائے گی۔

سید محی الدین زور

حضرت مولینا ارشد تھانوی

انگریز بہادر کی جے ــــــــــــــــــــــــــــــــ سامراج زندہ باد

ہندو مسلمان لڑ رہے ہیں۔ مردوں کے سر پھاڑے جا رہے ہیں۔ عورتوں کی چھاتیاں کاٹی جا رہی ہیں۔ لڑکوں کو میخوں سے ٹھوکا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کی عصمت دری ہو رہی ہے۔ گھروں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ سامانِ معیشت پھونکا جا رہا ہے۔

اخبارات ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں۔ پوسٹر چسپاں ہو رہے ہیں۔ پمفلٹ تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ کتابچوں کی اشاعت ہو رہی ہے۔ شعلوں کو ایندھن مل رہا ہے۔

یہ ہیں ہمارے ہندوستانی زبانوں کے صحافی۔ ادیب۔ شاعر۔ مصنف، اور ۲۴ انشا پرداز، جنہوں نے فرقہ وارانہ زہر پھیلا پھیلا کر ذہنیتِ عامہ کو مسموم ــــــــــ دماغوں کو ماؤف بنانے میں خود غرض لیڈروں اور رجعت پسند سرمایہ داروں کے مقاصد کی پوری پوری تکمیل کی اور ملک میں ہر طرف فتنہ و فساد کی چنگاریوں کو ہوا دے دے کر ہندوستان جنت نشان کو جہنم زار بنا کر رکھدیا۔

اسی فضائے ادب و شعر میں ایک مردہ گروہ اور بھی سانس لے رہا ہے۔ جسے "ترقی پسند مصنفین" کا نام دیا جاتا ہے۔ اُسے دوسروں کی آنکھ کے تنکے کی تلاش نہیں ہے۔ وہ اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھ رہا ہے اور ابنائے وطن کی درندگی، وحشت اور قتل و غارت گری کو دیکھ کر چلا اٹھتا ہے۔

"خونی ہے ہندوستان"

بھوپال کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے افراد ان مناظر کی تاب نہ لا کر کلیجہ پکڑ لیتے

ہیں اور زبانِ قلم سے خون تھوک کر ملک کے خونخوار بھیڑیوں کو درسِ آدمیت دینے اور جامۂ انسانیت میں لانے کی بے اختیارانہ کوشش کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ مضامین انکی سعیٔ مضطرب کے نتائج فکری کا شیرازہ ہے، جن کی تدوین و اشاعت کے لئے ملک کے ہر بہی خواہ، امن پسند اور نیک دل انسان کو جناب یکتا امروہوی کی، ہوشمندانہ صلاحیتِ عمل کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے عین موقعہ پہ اس کتاب کو چھاپ کر بھڑکتی آگ پہ پانی ڈالا ہے۔

ارشد تھانوی •

پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی میسور یونیورسٹی

مکرمی!

کرم نامہ مورخہ ۱۳ جنوری اور کتاب و خوتی ہے ہندوستان ہو کے پوسٹر کے ارسال کا شکریہ! مجھے افسوس ہے کہ جواب لکھنے میں تاخیر ہو گئی۔ ادھر کئی رول سے مصروفیت زیادہ تھی۔ کتاب غالباً اب تک چھپ چکی ہو گی اور
۲۴ یہ اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ میری رائے کسی قابل بھی ہوتی۔

موجودہ سیاسی حالات کے مدِنظر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی دو قومیں قوموں میں باہمی اعتماد۔ اتحاد اور ہمدردی پیدا کرنے کے لئے جو کوششیں بھی کی جاسکتی ہیں مستحسن ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے ادارہ کی سعیٔ جمیلہ اس باب میں بہت مشکور ہو گی۔

مخلص

عبدالقادر سروری

جناب احمد ندیم قاسمی مدیر "سویرا"

محترمی سلام مسنون!

جس نیک اور تعمیری مقصد کو مدّنظر رکھ کر آپ کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ اس سے کسی سچے ادیب کو دلچسپی اور ہمدردی نہیں ہو گی۔ ہمارے نئے ادب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے حالات کا آئینہ بن جائے۔ ایک ایسا آئینہ جس پہ نقوش مرتسم ہو جائیں اور آنے والی نسلیں ان سے فیض یاب ہوں۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو کامیاب کرے۔

احمد ندیم قاسمی

جناب شوکت تھانوی

اگر کسی سیاسی عقیدہ کے بغیر بھی ایک انسان کو انسان ہونے کا حق حاصل ہو سکتا ہے تو میں صرف انسان ہوں بلکہ سیاست کی قربانگاہ پر اپنی انسانیت کو بھینٹ چڑھانے کو بھی اتنا بڑا گناہ سمجھتا ہوں کہ شاید گناہوں کی فہرست میں صرف یہی ایک گناہ ایسا ہے جس کا بخشنا خود خدا نے بھی اپنے اختیار میں نہیں رکھا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں انسان اپنے انسان نہ ہونے کے خونچکاں ثبوت پر ثبوت دے رہے ہیں اور یہ طے کر چکے ہیں کہ زندگی اور انسانیت کے درمیانی اعتبارات کو درہم برہم کر کے رہینگے مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ترقی پسند مصنفین بھوپال نے یکتا صاحب امروہوی کے شیرانہ "خونی ہے ہندوستان" کیلئے وہ مواد فراہم
کیا ہے جو شایان انسانوں کو انسان ہونا یاد دلا سکے جو نسلوں سے انسان رہتے رہتے گھبرا کر درندگی کی ۲۶
طرف مائل نظر آتے ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی میں جو کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ بہار اور ضلع ہزارہ میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی ہے وہ انسانیت کی تاریخ کو ہمیشہ سرنگوں رکھے گی اور اسی کے ساتھ "خونی ہے ہندوستان" اس حیثیت سے پیش ہو سکیگا۔ جب ہندوستان کے انسان درندے بن چکے تھے اس وقت بھی ہندوستان میں ایک جماعت ایسی تھی جس نے انسانیت کے تحفظ کیلئے یہ قدم اٹھایا تھا۔

یکتا صاحب امروہوی کے اس مجموعہ میں صرف اسی لئے میں خود بھی شامل ہونا چاہتا ہوں کہ اس نسل کے بعد کا مؤرخ مجھ کو اور میرے خاندان کو شیروں، بھیڑیوں اور کتوں وغیرہ کے شجرہ میں تلاش نہ کرے۔ بلکہ میرا پتہ اس کو "خونی ہے ہندوستان" سے مل سکے۔ کہ میں بھی اس انسانیت سے بیزار دور میں بمشکل تمام انسان بنا رہا۔

شوکت تھانوی

جناب صمد شاہین مدیر "نیا دور"

مکرمی!

ایسے وقت جب ہندوستان کے ہر کونہ میں ہندو مسلم منافرت بڑھ
رہی ہے۔ ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ حتی الامکان اس تعصب کو دور کرنے میں
کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے "خونی ہے ہندوستان" کی اشاعت اس وقت یقیناً فائدہ مند ۲۷
ثابت ہوگی۔ چونکہ اس مجموعہ میں افادی عنصر پر زیادہ اہمیت ہوگی۔ نقاد انھیں فن پارے
کی حیثیت سے جانچنے میں حق بجانب نہ ہوں گے۔ اگر جانچیں بھی تو کیا حرج ہے؟ اس
کی مقصدیت سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ آپ کا یہ اقدام ہر طرح سے مستحسن ہے۔

نیاز کیش

صمد شاہین

جناب ساغر نظامی مدیر "ایشیا"

محترمی یکتا صاحب!

"خونی ہندوستان" کا موضوع ملک کی خانہ جنگی اور ہندو مسلم فسادات ہیں اور ان کا حل انجمن ترقی پسند بھوپال کے اراکین و مصنفین کے نزدیک ملک کے تمام فرقوں کا اتحاد ہے۔ میرا غالب خیال ہے کہ "خونی ہندوستان" کے مصنفین نے وقت کی سب سے پہلی ایسی ضرورت کو اپنی نظموں اور کہانیوں میں پوری ادبیت اور قوتِ خطابت کے ساتھ ظاہر کیا ہوگا۔ ملک کا آج جو حال ہے وہ کسی دردمند دل سے پوشیدہ نہیں۔ تمام تر خونی طوفان کا ماحصل یہ ایک نکتہ ہے کہ آج سے تیس چالیس سال قبل جو زہریلے بیج انگریز نے اس سرزمین میں ڈالے تھے۔ ان سے پہلے پودے نکلے اور ماضی کی گود میں پروان چڑھ کر
۲۸ بالآخر وہ زہریلے پودے تناور درخت بن گئے اور ٹھیک بین الاقوامی سیاست کے نقطۂ عروج کے وقت وہ پھل دینے لگے۔ انگریز کو انہی پھلوں کی ضرورت تھی۔ ملک کی فرقہ وارانہ سیاست پر تبصرہ آسان نہیں لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا ؎

خونِ آدم کا یہ سیلاب، یہ غم کا محشر ٭ اسی محشر سے اُبھرنے کو ہے اک راہگذر

چاروں طرف مایوسی کا زہر آلود کہر چھایا ہوا ہے افراد اور جماعتوں کے دل و دماغ مسموم اور مفلوج ہیں ایک دوسرے کے عرفان کی اہلیت ان کے اندر دم توڑ چکی ہے۔ لیکن میں اس کے باوجود مایوس نہیں۔ میں مسلمانوں کی خود مختاریت اور یہاں کی تمام قوموں کی محبت اور اتحاد پر ایمان رکھتا ہوں۔ میرا سیاسی مشرب یہ ہے کہ جب بھی برطانوی سامراج کو ہندوستان میں شکست ہوئی تو ہندو مسلمانوں کے متحدہ محاذ پر جم کر مقابلہ کرنے ہی سے ہوگی اور ہندو مسلمان ایک دن ضرور ایک ہوں گے کیونکہ بغیر ایک ہوئے دونوں اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ خونی جدوجہد کو نقصان سے بچانے اور امن و آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے انجمن ترقی پسند بھوپال اور آپ نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بلاشک و شبہ ملک کی عظیم الشان خدمت ہے اور اس خدمت پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے!!

ساغر نظامی

مسٹر پریم ناتھ پردیسی

محترمی!

آجکل کے زمانہ میں جب سیاسی مجاھدوں کے دنگل میں بیگناہوں کا خون پانی سے زیادہ سستا ہوگیا ہے اور بھائی بھائی کا دشمن بن گیا ہے۔ آپ کی یہ ادبی کاوش بے حد قابل ستائش ہے۔ بدقسمت ہندوستان کا بدنصیب ادیب اگر کچھ نہیں، کم سے کم ایسے ماحول میں خاموش رہ کر اپنے ضمیر اور اصلاحی حیثیتوں سے دغا نہیں کرسکتا۔ اسے اپنی زبان اور اپنی آواز سے اس درندگی کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔ 29

مجھے اُمید ہے۔ ملک کا ہر بہی خواہ بلا امتیاز مذہب و ملت آپ کی دردمندانہ اپیل کا خیر مقدم کرے گا۔

نیاز کیش

پریم ناتھ پردیسی

خود اپنے قلم سے

جب ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ جب بھائی، بھائی کے چھرا گھونپ کر ۳۰
مسکرا رہا تھا۔ جب ہندو مسلم منافرت کا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ جب تعصب کا
دہکتا ہوا لاوا سارے ہندوستان میں اُبل پڑا تھا ——— عین ——— اس وقت
——— "انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال" کے حساس اراکین اس بربریت پر
خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ ان کے معصوم دل اس بہیمیت کو برداشت نہ کر سکے۔
اور ان کا ذہن جو خارجی حالات کا عکس ہونے کے ساتھ ساتھ ماحول کو تبدیل کرنے کی
بھی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے انسداد کے لئے آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ
اس کتاب کے افسانوں اور نظموں میں ان ہی آنسوؤں کو سمو کر رواداری اور اشتراک
باہمی کی اپیل کی گئی ہے۔ تاکہ ہماری عوامی جد و جہد کو نقصان نہ پہنچے۔ اور ہماری
طاقت آپس میں ٹکرا کر بلا وجہ ضائع نہ ہو ——— ان اہم اور افادی تاثرات

کو کتابی شکل میں ہندوستان کے چالیس کروڑ انسانوں کے سامنے میں صرف اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ وہ بھی اپنی زندگی کے اس بھیانک اور تاریک رُخ کو دیکھ سکیں اور متفقہ طور پر اس لعنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں میں ہندوستان کے جلیل القدر صحافی اور ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار برادرِ محترم سلمان الارشد فاروقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کا بیحد شکر گذار ہوں کہ انھوں نے انتہائی مصروفیت کے باوجود اپنے قیمتی لمحات یہ کہہ کر بیجا پر سے نچھاور کر دئیے کہ سلمان اور یحیٰ دو علیحدہ علیحدہ شخصیتیں نہیں۔ بلکہ دو قالبوں کی ایک روح کے مختلف نام ہیں۔ گو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سلمان اس شکریہ سے بالاتر ہیں۔ کیونکہ انھیں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلہ کی پروا 31

اس کے ساتھ میں اراکین انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کے سلسلہ میں مجھ سے ہر طرح کا تعاون واشتراک فرمایا

کتاب کی طباعت و اشاعت میں اعلانات کے لحاظ سے تاخیر ہو گئی لیکن اس سلسلہ میں میں خود کو بے قصور سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ آجکل کسی چیز پر آزادانہ اپنا اختیار نہیں۔ بلکہ حکومت سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ چنانچہ کاغذ کی اجازت ۲۹ مارچ کو ملی۔ باقاعدہ احکامات جاری ہوئے اور اجازت نامہ میرے پاس ۱۵ اپریل کو پہونچا۔ اس کے بعد تمام مارکیٹ میں تلاش کیا لیکن جس جگہ جائیے۔ سوائے نفی کے اثبات کا کام نہیں۔ خدا خدا کر کے کاغذ ملا۔ تب کہیں طباعت

کا سلسلہ شروع ہوا۔ ورنہ کاپیاں تو اعلان کے مطابق پوسٹر شائع کرنے سے
دو تین روز قبل پریس میں پہونچائی جا چکی تھیں

"خونی ہے ہندوستان"



مسٹر نسیم سندیلوی بی اے (آنرز) ایم۔ اے



☞

یکتا امروہوی



ہندوستان کے جلیل القدر
صحافی اور ممتاز ترقی پسند
افسانہ نگار
سلمان الارشد فاروقی
جنرل سکریٹری انجمن ترقی
پسند مصنفین بھوپال

ابراہیم یوسف بی۔ اے

خون کی بوندیں

افرادِ تمثیل:

منصور:۔ ایک بہترین مصوّر

اندو:۔ ایک بہترین رقاصہ

ورما:۔ اندو اور منصور کا دوست

شکنتلا:۔ اندو کی سہیلی، ایک سوسائٹی پسند خاتون!

ملازمہ:۔ فسادیوں کا ایک گروہ اور پولیس وغیرہ!

منظر

منصور کا کمرہ، جو اس کے نگارخانہ کا کام دیتا ہے، چونکہ ایک اچھا مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا مجسمہ ساز بھی ہے۔ اس واسطے تمام کمرہ میں

بہترین مجسمے جس پر ان سے اکثر کل ہند نمائشوں میں انعامات ملے ہیں۔ رکھے ہیں۔ تمام کمرے میں متعدد تصاویر آویزاں ہیں جن میں کئی تصاویر گذشتہ سالوں میں سال کی شاہکار تصاویر قرار دی جاچکی ہیں تمام نگار خانہ میں بڑے بڑے آئینے لگے ہیں۔ کمرہ میں چاروں طرف روشن دان ہیں۔ جن میں روشنی آنے کے واسطے بڑے بڑے شیشے لگے ہیں۔ کمرہ میں کئی کھڑکیاں ہیں، جو اس وقت روشنی آنے کے واسطے کھلی ہوئی ہیں۔ کمرہ میں متعدد بڑی بڑی الماریاں رکھی ہیں جن میں قیمتی کتابیں بہترین گرد وپیش کی سلیقہ سے چنی ہوئی ہیں۔ نگار خانہ میں دو دروازے ہیں۔ ایک اندرون مکان کھلتا ہے اور دوسرا بیرون مکان، دروازوں اور کھڑکیوں پر قیمتی ریشمی پردے پڑے ہیں۔ تمام کھڑکیوں کے پردے اس وقت ہٹا دیے گئے ہیں۔ نگار خانہ میں قیمتی صوفے سیٹ لگے ہیں، اور کرسیاں سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ اس وقت دن کے تقریباً ۹ بجے ہیں۔

اندو ایک کرسی پر سفید ساڑھی پہنے بیٹھی ہے۔ کچھ فاصلہ پر منصور ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنے کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ میں رنگوں کی کشتی ہے اور دوسرے میں برش۔ اس کے سامنے ایک پردہ لٹک رہا ہے جس پر اندو کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ منصور کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر ایک سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس پڑی ہوئی ہے۔ منصور آہستہ آہستہ گنگنا رہا ہے۔ کبھی تصویر کو دیکھتا ہے اور کبھی اندو کو، کبھی برش

تصویر پر چلانے لگتا ہے۔ اندو خاموشی سے منصور کو دیکھ رہی ہے۔ کچھ
دیر بعد انگڑائی لے کر،

اندو۔ منصور بھیّا،

منصور۔ (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) کیا ہے اندو؟

اندو۔ بس کیجئے۔ میں تو اب بیٹھے بیٹھے اکتا گئی۔

منصور۔ (اسی طرح مشغول رہتے ہوئے) بس اندو تھوڑی دیر اور (اندو کو دیکھ کر) فنشنگ ٹچیز
ہیں۔ میں بھی تو ——————۔

اندو۔ (قطع کلام کر کے) تو بس کیجئے۔ بیکار بیٹھے بیٹھے سر میں درد ہونے لگا

منصور۔ (پھر اپنے کام میں مشغول ہو کر) دیکھ اندو —— آج تصویر مکمّل ہو جائے گی۔

اندو۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر —————— ۳۵

منصور۔ (برش اور کشتی میز پر رکھتے ہوئے) اچّھا اچّھا۔ جیسی تیری مرضی (مسکرا کر) میں اپنی اندو کو
ناراض کرنا نہیں چاہتا۔

(تصویر کو بغور دیکھنے لگتا ہے۔ اندو کرسی سے اٹھ کر منصور کے
پاس مسکراکر آتے ہوئے)

اندو۔ شکریہ آپ کا منصور بھیّا!

منصور۔ (اندو کو بہت ہی پیار کی نظروں سے دیکھ کر) میں اپنی اندو کو بہت پریشان کرتا ہوں
(مسکرا کر) ناراض تو نہیں ہوتیں؟

اندو۔ (شرارت سے مسکرا کر) بہت —— میں تو عاجز آچکی ہوں آپ سے!

منصور۔ (تصویر کو دیکھتے ہوئے) اچھا اندو —— تجھے یہ تصویر کچھ پسند بھی ہے یا نہیں ——؟

اندو۔ (شرارت سے مسکرا کر) بالکل نہیں۔ لیکن آپ محنت ضرور کافی کر رہے ہیں۔

منصور۔ مجھے محنت کی بالکل پرواہ نہیں۔ مگر اس کا خیال ضرور ہے کہ ———

اندو: (مسکرا کر قطع کلام کر کے) میں پریشان ہوتی ہوں ——— اس میں پریشانی کی کونسی بات ہے؟

منصور۔ تجھے میری محنت کا احساس ہے۔ بس کافی ہے (اندو کا چہرہ دیکھ کر) اور جس وقت تو یہ کہتی ہے کہ مجھے یہ تصویر پسند ہے ——— تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے میرا انعام مل گیا ہے۔

اندو۔ لیکن میں ظاہری خوب صورتی سمجھتی ہوں۔ فن کی باریکیاں کیا سمجھوں۔

منصور۔ اگر دنیا کے تمام فن کار بھی اس کی ہر لائن میں خامیاں نکالیں۔ تب بھی میرے دل کو اس سے تسکین ہو جائے گی۔ کہ تو نے اسے پسند کر لیا ہے اور بس یہی کافی ہے۔ ۳۶

(ملازمہ داخل ہوتی ہے)

ملازمہ۔ اندو بیا ——— بیگم صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں ——— ناشتہ نہیں کیجئے گا؟

منصور۔ (تعجب) ہیں اندو ——— تو نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔

اندو۔ (مسکرا کر) میں تو بستر سے اُٹھ کر آپ ہی کے پاس چلی آئی تھی کہ آپ سے آ کر عرض کروں کہ آج رکشا بندھن کا تہوار ہے ——— راکھی باندھوں گی آپ کے ——— اور یہاں آپ نے مجھے قید کر لیا۔

منصور۔ (مسکرا کر) ضرور باندھو ——— مجھے کب انکار ہے ——— اچھا جاؤ ناشتہ کرو دیکھو اندو، یہ لاپرواہی مجھے بالکل پسند نہیں۔

(اندو اور ملازمہ نگار خانہ سے نکل جاتی ہیں۔ منصور، تصویر کو غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر کمرے میں ٹہلتا ہے اور کچھ آہستہ آہستہ گنگناتا ہے

پھر تصویر کے پاس کھڑے ہو کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے)

منصور۔ اندو ـــــ تیرا منصور بھیا بدنامی سے نہیں ڈرتا ـــــ کاش دنیا والے بھی کچھ وسیع النظر ہوتے ـــــ خیر ـــــ میں دنیا کے طعن وطعن برداشت کرتا رہوں گا۔

(ورما داخل ہوتے ہوئے)

ورما۔ ہلو منصور! کیا ہو رہا ہے؟

منصور۔ آہا ـــــ مسٹر ورما ـــــ بھئی یہ چاند صبح صبح کیسے نکل آیا ـــ کہو مزاج تو اچھے ہیں؟

ورما۔ (مسکرا کر) جی رہا ہوں ـــ کیا گوشہ نشین ہو گئے ہو ـــ کلب آنا جانا کیسے چھوڑ دیا؟

منصور۔ کیا بتلاؤں ـــ آجکل بہت عدیم الفرصت ہو رہا ہوں۔ اوّل تو نجمی کی موت کے بعد اپنی زندگی میں ایک کمی محسوس کرنے لگا ہوں ـــ اور دوسرے ـــــ (سگریٹ جلا کر) جب سے اندو میرے ساتھ ہیں ہے۔ میں ایک ذمہ داری محسوس کرنے لگا ہوں۔

ورما۔ تم نے اندو کے لئے جو قربانیاں دی ہیں وہ قابل رشک ہیں ـــــ مگر افسوس اس کا ہے کہ دنیا کچھ ـــــــــ

منصور۔ (طنزیہ مسکرا کر، ورما (غور سے ورما کا چہرہ دیکھ کر) افسوس تو ان لوگوں کو ہوتا ہے جو

بجنی لالچ یا خود غرضی کی بنا پر قربانی دیتے ہیں ۔۔ میں قربانی کو ایک مقدّس فرض سمجھتا ہوں۔

ورما۔ (چہرے پر سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے) یہ انسانی زندگی کی معراج ہے ـــــ ڈیر منصور لیکن ہماری سوسائٹی اس قدر وسیع النظر نہیں کہ تمھاری قربانی کی قدر کرے!

منصور۔ کسی چیز کی قدر اس کا انعام ہے اور انعام کی خواہش اعتراف شکست (طنزیہ مسکرا کر) اچھا یہ کہو۔ کیسے آنا ہوا؟

ورما۔ ویسے ہی چلا آیا ـــ کئی روز سے ملاقات نہیں ہوئی تھی (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیوں منصور! اندو کی زندگی میں جو خلیج پیدا ہو گئی ہے وہ پُر نہیں کی جا سکتی؟

منصور۔ کیوں نہیں؟ میری عین خواہش ہے کہ ـــــــــــــــ

ورما۔ (سگریٹ جلا کر) جوانی اور پھر عورت کی جوانی ـــ بہشت کی رعنائیوں ـــ چاند کی دلکشی ـــ اور پھولوں کی نکہت سے مرکّب ہے ـــ اس پر غم و الم کے پردے اچھے نہیں لگتے۔ ۴۸

منصور۔ (طنزیہ مسکرا کر) یہ شاعر کب سے ہو گئے ہو؟

ورما۔ جس وقت فرض اور محبّت کی کشمکش میں محبّت نے فتح پائی۔

منصور۔ بجنی کی موت کے بعد وہ کسی اور سے شادی کو تیار ہو گی ـــ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اور معاف کرنا تم ایک جذباتی انسان ہو ـــ جو وقتی چیز فضا سے مشتعل ہو جایا کرتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت بھی ـــــــــــــــ

ورما۔ منصور! میں یقیناً ایک جذباتی انسان ہوں ـــ مگر بچّہ کی طرح انگارہ کو چمکدار کھلونا سمجھ کر تو نہیں اُٹھا سکتا (سگریٹ کا ایک بڑا سا کش لے کر) میں اس سوسائٹی کے

مُنھ پر ایک طمانچہ مارنا چاہتا ہوں۔ چاند وسے اس وجہ سے نفرت کرتی ہے۔ کہ وہ نجمی سے محبت کرتی تھی۔

منصور۔ تم جانتے ہو کہ نجمی کی موت کے بعد اس نے میرا سہارا ڈھونڈا ہے اور جب کہ تمہاری سوسائٹی اس کو ٹھکرا چکی تھی۔ میں اسے سہارا دینے کو تیار رہا ــــ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا ــــ خیر ــــ میں تم میں ایک جرأتِ عمل پاتا ہوں ــــــ مگر ـــــــــــ

ورما۔ تم ہمیشہ سے میری ذات سے مشکوک رہتے ہو ــــ (مسکرا کر) تمہاری حالت اس عورت کی طرح ہے جس کی ساڑی غیر مرد کے جھٹکے سے کھُل گئی ہو اور برہنگی سے قطع نظر یہ سوچ رہی ہو کہ ساڑی پھٹ تو نہیں گئی۔

منصور (مسکرا کر) ہاں ــــ میں یہی دیکھتا ہوں ــــ لیکن تم دیکھتے ہو کہ ساڑی میلی تو نہیں ہو رہی ہے۔ ۳۹

(شکنتلا مسکراتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

منصور (شکنتلا کو دیکھ کر) اوہو ــــــــــــ کہئے مزاج تو اچھے ہیں؟

شکنتلا۔ عنایت ہے آپ کی (ورما سے مخاطب ہو کر) کہئے مسٹر ورما ــــ آج تو صبح صبح نازل ہو گئے آپ!

ورما۔ جی ہاں بس آ گیا ــــ کہئے ڈاکٹر صاحب کے مزاج کیسے ہیں ــــ آج کل نظر نہیں آتے؟

شکنتلا (مسکرا کر) دن رات وہ ہیں اور مریض ــــ فرصت کہاں ہے اُن کو ــــ!

منصور (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھئے۔ کوئی خدمت میرے لائق ــــ!

شکنتلا۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) بس مہربانی ہے آپ کی ——— کہئے اندو کہاں ہے؟

منصور۔ اندر ہے (ورما سے) مسٹر ورما کبھی آپ نے اپنے اس خیال کا اندو سے اظہار کیا۔

ورما۔ ہاں ——— لیکن صاف الفاظ میں نہیں ——— وہ خود کچھ اس قدر سمجھدار ہے۔

کہ جب اس موضوع پر گفتگو آتی ہے وہ بات صاف اُڑا جاتی ہے۔

شکنتلا۔ کس موضوع پر؟

منصور۔ اندو کی آیندہ زندگی پر!

شکنتلا۔ میں بھی کئی روز سے سوچ رہی تھی۔ کہ آپ سے اس موضوع پر گفتگو کروں۔

لیکن موقعہ ہی نہ ملا ——— میرا خیال ہے آپ کا اس سے علیحدہ ہو جانا ہی مناسب

ہے ——— ہم دنیا کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔

40 منصور۔ ہاں ——— دنیا کچھ اس قدر کور باطن واقع ہوئی ہے کہ کسی چیز کو حقیقت کی

نگاہ سے دیکھنا اس کے لئے گناہ ہے ——— لیکن ——— (سگریٹ کا کش لے کر)

آخر کیا کیا جائے ——— معلوم نہیں اندو اُسے پسند کرے گی یا نہیں ———

میری تو دلی خواہش ہے کہ وہ شادی کرلے۔

شکنتلا۔ یہ میرا ذمہ ہے۔ میں اُسے راضی کرلوں گا۔

منصور۔ (دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) میں اُسے یہیں بھیجے دیتا ہوں ——— آپ ابھی کوشش

کیجئے (نگار خانہ سے نکل جاتا ہے)

شکنتلا (کچھ دیر خاموش رہ کر) ورما تم مطمئن رہو ——— میں اُسے راضی کرلوں گی۔ مجھے اس

منصور سے ہمیشہ کی عداوت ہے۔ دنیا منصور کو فرشتہ سمجھتی ہو۔ مگر

میں نہیں؟ ———

ورما۔ میں بھی اس منصوبہ سے نفرت کرتا ہوں ـــــ مگر وہ کئی مرتبہ اس کا اظہار کر چکا ہے کہ اسے لعن طعن کی پرواہ نہیں۔

شکنتلا۔ ان کا یہ بار بار اظہار ہی تو اعتراف شکست ہے۔ جب کسی چکنی چیز پر کھڑے ہو کر قدم ڈگمگاتے ہیں تو انسان بھی چلاتا ہے کہ وہ چکنی چیز پر کھڑا ہے مگر اسے اس کی پرواہ نہیں ـــــ بہرحال ہم آج جس کام کے واسطے آئے ہیں اُسے پورا ہی کریں گے (باہر سے قدموں کی آہٹ) مسٹر ورما آپ ذرا باہر تشریف لے جائیے۔

(ورما تیز تیز قدموں سے نگار خانہ سے نکل جاتا ہے اندو داخل ہوتی ہے)

اندو۔ کیوں شکنتلا ـــــ خیریت تو ہے ـــــ سامنے کیسے بھول گئیں؟ ـــــ

شکنتلا۔ آؤ اندو ـــــ اے تم نے شکل کیسی بنا رکھی ہے۔ میں تو بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔

41

اندو۔ ہاں ذرا ناشتہ کے بعد اماں جی سے گفتگو کرنے لگی تھی ـــــ مسٹر ورما کہاں ہیں؟

شکنتلا۔ انتظار کرتے کرتے چلے گئے ـــــ بھئی تم بھی خوب ہو۔ کلب آنا جانا ترک کر دیا کلب اسٹیج اب تمہارے ڈانس کو ترس رہا ہے۔

اندو۔ ہاں میں نے اب ڈانس کرنا چھوڑ دیا ہے۔

شکنتلا۔ (تعجب سے) آخر کیوں؟ ـــــ

اندو۔ میں جس کے لئے ڈانس کرتی تھی۔ جب وہ ہی نہیں رہا تو پھر ڈانس کیسا؟

شکنتلا (ایک کتاب دکھلاتے ہوئے) یہ کتاب دیکھی ہے تم نے؟

اندو۔ جی ہاں (طنزیہ) کہئے۔

شکنتلا۔ دنیا مجھی کو بھول چکی ہے۔ لیکن تم ابھی تک دنیا کی نظروں کے سامنے ہو ـــــ

بجمی کے ڈراموں پر تبصرہ ہے۔ لیکن تمہارے کیریکٹر پر حملے کر اس کی تباہی کا سبب
تم ہو۔

اندو۔ تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہاں میں ایسی چیزیں دیکھ کر مسکراتی ہوں،
اور سمجھ لیتی ہوں کہ ان لوگوں میں دوراندیشی نہیں۔ تبصرے کا مقصد ان لوگوں
کے نزدیک ذاتی بغض و عناد کی خاطر کسی کے کیریکٹر پر حملے کرنا ہے۔

شکنتلا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو ——— میں تمہیں ایک صائب رائے دینا چاہتی ہوں۔

اندو (مسکرا کر) مجھے معلوم ہے کہ تم بھی کہو گی کہ شادی کر لو ——— ورما سے ———
مگر معاف کرنا شکنتلا۔ میں شادی کے لئے تیار نہیں۔

شکنتلا۔ اندو، مجبور تو تمہیں کوئی نہیں کر سکتا ——— لیکن کم از کم میں اس قدر ضرور کہہ سکتی
ہوں کہ شادی اور محبت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔

اندو۔ ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو ——— لیکن میں شادی اس واسطے کرنا نہیں
چاہتی کہ محبت نہیں کر سکتی۔

شکنتلا۔ لیکن شادی ایک حقیقت ——— زندگی کا سب سے بڑا کیف ہے۔ ایک نشہ ہے
اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس سے زندگی میں ہزاروں رومانس پیدا
ہو جاتے ہیں۔

اندو (مسکرا کر) یہ سب کچھ ٹھیک ہے (طنزیہ مسکرا کر) اور یہ رومانس تم ہی کو مبارک
ہوں۔ مجھے تو بخشو۔

شکنتلا۔ لیکن تم یہاں کب تک زندگی گذارو گی ——— ہم آجکل کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے ———

اندو۔ (غصہ سے) دیکھو شکنتلا، میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں ——— مگر منصور بھیا

کے متعلق کچھ نہیں سُن سکتی۔

شگفتہ۔ لیکن آخر ورما میں کیا بُرائی ہے۔ وہ تمہارے لئے بہت قربانیاں دے چکا ہے

اندو۔ ان کی اپنی قربانی کا بار بار اظہار ہی تو ان کی شکست ہے۔

(ورما غصہ سے تیزی سے کمرہ میں داخل ہو کر)

ورما۔ بس ــــ بہت ہو چکا۔ منصور نے انھیں ایسے بہت سے سبق پڑھا رکھے ہیں۔ (غصہ سے بلند آواز میں) مسلمان خود کو علیحدہ قوم بتلاتے ہیں ــــ وہ پاکستان چاہتے ہیں ــــ اکھنڈ بھارت سے انھیں نفرت ہے ــــ انھیں ہماری ہر چیز سے نفرت ہے ــــ ہم اُن سے نفرت کیوں نہ کریں ــــ دنیا کہاں کی کہاں پہونچ چکی ہے ــــ بھارت ماتا کی گود میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور یہ ابھی تک رواداری اور اشتراک کی رٹ لگائے جا رہی ہیں ــــ سن لو اندو ذرا کان کھول کر ــــ ۴۳ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ تم یہاں رہو۔

اندو۔ بس کر چکے آپ ــــ یہ خون کی ندیاں نہ پاکستان کے لئے ہیں نہ اکھنڈ بھارت کے لئے ــــ یہ صرف چند انسانوں کی انفرادی خود غرضی ہے۔ فرداً فرداً آپس کی عداوت کی بنا پر ــــ عوام کو آپ جیسے چند لوگ بھڑکا رہے ہیں ــــ ہماری مشترکہ تہذیب ختم کی جا رہی ہے۔ تاریخ میں بدنما داغ چھوڑے جا رہے ہیں۔ دنیا کے سامنے ہمیں وحشیوں سے زیادہ ذلیل کیا جا رہا ہے۔ بھارت ماتا کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ لگا دیا گیا ہے (ٹھنڈے ہو کر آہستہ آہستہ) ہمارا فرض تو اس وقت آپس کی دشمنی اور عداوت کو ختم کرنا ہے جھگڑے مٹانے کی ضرورت ہے، بڑھانے کی نہیں۔ رواداری ہی ہمارا شیوہ ہو کہ ایسے اشتعال انگیز الفاظ کے ذریعے ایک ہزار

سال کے پُرانے رشتہ کو ختم کر دیا جائے۔

ورما۔ خیر یہ نصیحتیں سننے یہاں نہیں آیا ہوں ـــــ میں تم سے اب صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ تم منصور کے ساتھ نہیں رہ سکتیں ـــــ بڑا پارسا بنا پھرتا ہے

اندو۔ (غصّے سے) خاموش رہئے میں کہہ چکی ہوں کہ منصور بھیّا کے متعلق کچھ نہیں سُن سکتی۔

ورما (غصّہ سے) اس شخص کے متعلق نہیں سُن سکتی جس کے نزدیک قول و فعل اور اصول بے معنی چیزیں ہیں جس کا مذہب بُت شکنی کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن بُت تراشی اور مصوّری جس کا پیشہ ہے ـــــ جو مذہب کا نہ ہوا وہ کسی کا نہیں ہو سکتا ـــــ خیر میں دیکھ لوں گا (غصّہ سے نگار خانہ سے نکل جاتا ہے)

اندو۔ (شکنتلا سے مخاطب ہو کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس فساد کو پاکستان، اکھنڈ بھارت۔ مذہبی لڑائی اور جہاد کا کیوں نام دیا جا رہا ہے (نگار خانہ میں ٹہلنے لگتی ہے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) بھائی بھائی کے چھُرا گھونپ دیتا ہے اور فاتحانہ مسکراتا ہے (نفرت سے) یہ ہیں ان اکھنڈ بھارتیوں اور پاکستانیوں کے اعلیٰ جذبات! ۴۴

شکنتلا۔ اندو ـــــ حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے ہمیں مجبور کر دیا ہے ہم خود کو ان سے نہیں بچا سکتے۔

اندو۔ (نفرت سے شکنتلا کا چہرہ دیکھ کر) شکنتلا! مجھے تم سے بحیثیت ایک عورت کے ایسے خیالات کی امیّد نہ تھی۔ تم عورت ہو تمہارے جذبات میں محبت، خلوص اور ہمدردی ہونا چاہئے۔

شکنتلا۔ ضرور ہونا چاہئے ـــــ مگر میں چند وجوہ کی بنا پر ـــــــــــ

اندو (قطع کلام کر کے) ان کو مٹا چکی ہو (طنزیہ) کسی سے ذاتی بغض و عناد ہو گا۔

شکنتلا (اٹھکر) خیر کچھ بھی ہو (دروازے کی جانب جاتے ہوئے) تم جو کچھ بھی کر رہی ہو۔ اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

اندو۔ اس نصیحت کا شکریہ (غصّے سے) میں تمام نتائج برداشت کرنے کو تیّار ہوں ——

(شکنتلا کمرہ سے نکل جاتی ہے اور اندو نگار خانہ میں خاموشی سے ٹہلنے لگتی ہے منصور داخل ہوتا ہے)

منصور (اندو کا چہرہ دیکھکر) ورما اور شکنتلا کہاں چلے گئے ؟

اندو۔ (لاپرواہی سے) معلوم نہیں۔

(منصور اندو کا چہرہ غور سے دیکھتا ہے۔ جس پر اس وقت غم و غصّہ

اور نفرت کے ملے جلے اثرات ہیں۔ پھر اس کے خیالات کو دوسری

جانب متوجہ کرنے کے واسطے)

45 منصور۔ آؤ اندو —— اب تصویر مکمل کریں۔

اندو (چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) آپ اس قدر سخت محنت کرتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں پاگل نہ ہو جائیں۔

منصور (مسکراکر) نہیں، نہیں، نہیں! پاگل ہوتے ہیں بزدل اور میں بزدل نہیں —— لیکن تمھیں میری مصروفیات کا اس قدر خیال کیوں رہتا ہے ؟

اندو (شرارت آمیز مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ کی مصروفیات کا مجھے خیال رہتا ہے، جی نہیں۔ آپ تو خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے —— لیکن ہاں آپ کی صحت کا ضرور خیال ہے۔

منصور (مسکراکر) اندو! یہاں صحت پہلے ہی کہاں کی اچھی تھی —— مگر تم مطمئن رہو اپنی صحت اپنی جگہ سے ہلنے والی نہیں ہے۔

اندو۔ خیر کچھ بھی ہو۔ اماں بیا سوچیں گی۔ کہ میں آپ کا خیال نہیں رکھتی۔

منصور (شرارت سے) تو یوں کہو۔ اماں بیا کے سوچنے کا خیال ہے۔

اندو۔ (کچھ شرمندہ سی ہو کر) ہاں یوں ہی سمجھ لیجئے۔ کیونکہ آپ میرے منصور بھیّا تھوڑا ہی ہیں۔ جو دل دُکھے۔

منصور۔ تو پھر منصور بھیّا بڑے خوش قسمت ہیں۔ (دور سے شور و غل کی آواز آتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ قریب ہوتی جاتی ہے) یہ شور و غل کیسا ہے۔

(اندو کے چہرے پر پھر پہلے کی طرح غم و غصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آواز برابر قریب تر ہوتی جاتی ہے ——)

اندو۔ وہی خود غرض کُتّے ہوں گے۔ جو تہذیب و تمدن، فن اور ادب کو تباہ و برباد کرنے کا بیڑا اُٹھا چکے ہیں۔ جو اپنی تباہی پر مسکرا رہے ہیں اور اپنی تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر رہے ہیں۔

[شور بالکل مکان کے پاس آ جاتا ہے۔ منصور کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے۔ ایک پتھر آ کر کھڑکی کے شیشوں پر لگتا ہے جس سے شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ منصور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد متعدد پتھر شیشوں اور دیواروں پر آ کر لگتے ہیں اور کچھ پتھر نگار خانہ میں آ کر گرتے ہیں۔ اندو گھبرا کر منصور کو دیکھتی ہے۔ منصور بھی کچھ بدحواس سا ہو جاتا ہے۔ کچھ آدمیوں کی نگار خانہ کے پاس دوڑنے اور چلانے کی آواز آتی ہے اور چند سیکنڈ بعد کچھ لوگ لاٹھیاں لئے ہوئے نگار خانہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اُن کے ساتھ ودیا بھی ہے۔]

ورما۔ (منصور کی طرف اشارہ کرکے) یہی ہے وہ منصور جس نے ایک ہندو عورت کو اپنے یہاں جبراً رکھ چھوڑا ہے۔

(لوگ چلاتے ہوئے لاٹھیاں تان کر منصور پر جھپٹتے ہیں)

اندو۔ (منصور اور اُن لوگوں کے درمیان میں آتے ہوئے) نہیں، نہیں —— میں خود یہاں اپنی خوشی سے رہتی ہوں۔ کسی نے مجھے جبراً رکھ چھوڑا ہے۔

ورما (اندو کا ہاتھ پکڑ کر درمیان سے علیحدہ کرتے ہوئے) ہٹ جاؤ۔ ہمیں انتقام لینا ہے۔

(اندو زور زور سے چلاتی ہے۔ منصور خاموشی سے کھڑا رہتا ہی ایک شخص منصور پر لاٹھی سے حملہ کرتا ہے اور منصور کے سر سے خون جاری ہو جاتا ہے اور چکرا کر گر پڑتا ہے ——)

۴۷ ورما۔ (چیخ کر لوگوں کو مخاطب کر کے) مٹا دو اس بہشتِ ارضی کو —— فنا کر دو اس طلسم خیال کو —— اینٹ سے اینٹ بجا دو اس نگار خانہ کی —— ہمارے دشمن کی ذہنی کاوشوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دو۔ آیندہ ہمیشہ کے لئے اس کے نام و شہرت پر پردہ ڈال دو۔

اندو۔ (چیخ چیخ کر) ایسا نہ کرو —— وہ تمہارے بھائی ہیں دشمن نہیں —— تم ان سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔

(لوگ مجسموں، تصاویر اور دیگر قیمتی سامان کو توڑنے پھوڑنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ الماریاں توڑ ڈالتے ہیں۔ ایک آخری الماری کی جانب بڑھتے ہیں)

اندو۔ اس الماری کو ہاتھ نہ لگانے —— اس میں بخمی کے ڈراموں کے مسودے ہیں۔

اس میں اتحاد کے دیوتا چھپے ہوئے ہیں۔ اس میں رواداری۔ خلوص۔ محبت و پریم کے لازوال شہ پارے ہیں۔

[الماری کی جانب بڑھتی ہے۔ کوئی شخص ایک مجسمہ اٹھا کر پھینکتا ہے جو اس کی پنڈلی میں آ کر لگتا ہے۔ جس سے پنڈلی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ چیخ کر گر پڑتی ہے۔ ایک دوسرا مجسمہ اس کے سر میں آکر لگتا ہے۔ اور سر سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ لوگ اس الماری میں آگ لگا دیتے ہیں۔ ایک مجسمہ منصور کے ہاتھ پہ آکر گرتا ہے۔ جس سے اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں چکنا چور ہو جاتی ہیں۔ پولیس زنگار خانے میں بندوقیں لئے داخل ہوتی ہے اور ان فسادیوں کو گرفتار کر لیتی ہے]

48 اندو۔ (آہستہ آہستہ سر اٹھا کر) دیکھا اس دشمنی کا نتیجہ؟ ——————

[پولیس والے تمام فسادیوں کو گرفتار کر کے لے جاتے ہیں۔ چند پولیس والے اندو اور منصور کے پاس رہ جاتے ہیں۔ اندو اپنی ساڑی سے ایک حصہ پھاڑ کر جو خون سے رنگا ہوا ہے منصور کے ہاتھ پر باندھتے ہوئے]

اندو۔ آج رکشا بندھن ہے یہ خونی راکھی بندھوا لو بھیا! ——————

[منصور آہستہ آہستہ سر اٹھانے کی کوشش کر کے اندو کو دیکھتا ہے اس کے سر سے بہتے ہوئے خون کے قطرات اندو کی باندھی ہوئی راکھی پر گرتے ہیں اور اندو کے خون میں جذب ہو جاتے ہیں —]

منصور (آہستہ آہستہ) اندو بہن! ——— اندو (مسکرا کر) منصور بھیا ——————!

(دونوں ایک دوسرے کو محبت کی نظروں سے دیکھتے ہیں) پٹی دکا

صہبا لکھنوی

خونی ہندوستان

۴۹ کانپ اُٹھے، تھرّا اُٹھے، کون و مکاں!
گیتی و دوراں کی نبضیں رُک گئیں
قصر و ایواں کی جبینیں جھک گئیں

چیخ اُٹھے انسانیت کے پاسباں!
کانپ اُٹھے، تھرّا اُٹھے کون و مکاں!
لُٹ گیا دم بھر میں دُلھن کا سُہاگ!

پھول سے نازک لبوں پر آہ، آہ
اُف ری ظالم موت کی خونی پناہ

لگ گئی ٹھنڈے دلوں میں جیسے آگ!
لُٹ گیا دم بھر میں دُلھن کا سُہاگ!

حیف اے تلخابۂ دورِ کہن!

خاک و خوں میں مل گئی سطوت نشاں
جھک گئے تہذیبِ نو کے آستاں

کھو کھلے اجسام، بے گور و کفن!
حیف اے تلخابۂ دورِ کہن!

جامۂ انسانیت اور تار تار؟

حرّیت کے نام پر غارت گری
بربرّیت، قتل و خوں عصمت دری

ڈوب مرا ے ابنِ آدم، ذی وقار!
جامۂ انسانیت اور تار تار؟

ہو رہی ہے منقلب اب کائنات
آ رہی ہے اپنے محور پر حیات

عمران الارشد

شگاف

آنکھوں میں دو تارے چمکے اور اُس کے رُخساروں پر پگھل گئے۔ اُس کو اپنے حلق میں کچھ ہنپت ہوا محسوس ہوا۔ جیسے وہ کچھ نگل رہا ہو اور اُس نے اپنی کھدر کی سفید قمیض سے آنسو پونچھتے ہوئے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔ جو اب بھی مسکرا رہا تھا اس کی تحقیر کرنے کے بعد بھی جُنّو کے شعور کی کسی تہ میں اس لڑکے کے جملے چکر لگانے لگے۔ جیسے دائرہ کی شکل میں گھوم رہے ہوں۔

"یہ سالے کوٹ کیوں نہیں پہنتا۔ جو نپل قمیض سے باہر نکلے۔"

جُنّو نے اپنا سر زور سے جھٹک دیا۔ بالکل اس طرح جیسے وہ اس بھاری جملہ کو اپنے دماغ سے باہر نکال کر پھینک دے گا۔ اس خاکی زمین پر، جہاں تھوک، غلاظت، کوڑا کچرا، سب ہی تو پڑا رہتا ہے۔ ایک یہ گندہ بھدّا، بدتمیز قسم کا جملہ بھی ———

وہ گھر کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا ——— آج کتنی شدّت سے اس کی

خواہش پھر جاگ اُٹھی تھی ـــــ صرف ایک خواہش ـــــ ایک کوٹ ـــــ اس کی نظریں راہ چلتے ہوئے بچوں، جوانوں اور بڈھوں پر رینگنے لگیں ـــــ لانگ کوٹ، شارٹ کوٹ، ڈبل بریسٹ، سنگل بریسٹ، گلابی، پیلا، زرد، نیلا، دھاری دار، چوخانہ دار، گرم اور ٹھنڈے کوٹ، سکڑے اور مڑے ہوئے، استری دار کوٹ، اُجلے اور میلے، ہر کوٹ میں اُس کو ایک نئی جاذبیت اور انوکھا پن نظر آرہا تھا۔ پھر اس کی نظریں اُن کی جیبوں میں گھُسنے کی کوشش کرنے لگیں۔ چپکے چپکے ـــــ چوری سے ـــــ جیسے وہ گرہ کٹ ہو ـــــ اُن کی تلاشی لینا چاہتا ہو ـــــ جیبوں میں سے جھانکتے اور سر نکالے ہوتے فونٹین پن ـــــ پنسلیں ـــــ اور نوک دار رومال ـــــ جیسے وہ اس کا مذاق اُڑانے کے لئے چونچ دکھا رہے ہوں ـــــ کتنے دلکش تھے ـــــ جسموں میں ساتھ پڑے ہوئے ـــــ کہیں کہیں سکوں کے دائرے اُبھرے ہوئے دیکھ کر اس کا دل تِلملا اُٹھتا تھا ـــــ کاش وہ ایک کوٹ پہن سکتا صرف ایک کوٹ ـــــ اس کو اپنی کمر پر ایک ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا ـــــ کندھے اور گردن پر ایک بھاری پن ـــــ جیسے وہ ایک کوٹ پہنے ہو ـــــ اور چلتے چلتے فٹ پاتھ کے قریب ایک بھاری دو منزلہ مکان کے سامنے ـــــ آ کر رک گئی ـــــ اور اس کے خیالات کے تسلسل میں ایک شگاف سا پڑ گیا ـــــ اس کو اس شگاف سے ایک سکون سا محسوس ہوا ـــــ اپنے اس دماغی خلفشار سے نجات پانے پر ـــــ وہ بس دیکھ رہا تھا ـــــ حسین عورتیں اونچی ایڑی والی گرگابی پہنے ہوتے، مہکتے ہوئے جسم، گرتے اور سنبھلتے ہوئے لباس ـــــ اور پھر گرم، ٹھنڈے سوٹوں میں ملبوس سرخ و سفید، گورے گورے یا گندمی جسم ـــــ اور وہ آگے بڑھ گیا۔ ان کوٹوں میں چھپے ہوئے جسموں کو نظر انداز

کرتا ہوا ـــ لیکن معصوم اور ہلکے شور سے اس کی نظریں غیر ارادی طور پر پیچھے دوڑ گئیں۔

دو، بارہ، تیرہ سالہ بچے بالکل اس کے ہی ہم عمر باتیں کرتے ہوئے بس سے اترے تھے ـــ کالا چمکتا ہوا جوتہ ـــ جیسے کسی نے سر میں تیل ڈال کر کنگھی کر رکھی ہو ـــ اور پوری پنڈلی کو چھپائے ہوئے گلابی جرابیں ـــ اور پھر حسین گورا گورا ابھرا ہوا گھٹنا ـــ جیسے کسی نے گرہ لگا دی ہو ـــ رانوں کے گداز گوشت پر ہلکا گلابی پھسلتا ہوا نیکر ـــ اور اوپر وہی گرم قیمتی سرمئی کوٹ ـــ گرم فالدار جس پر لہریں بن بن کر کونے میں بھاگ رہی تھیں ـــ گلے میں چرمی بستہ ٹنگا ہوا جھول رہا تھا ـــ اس کی نظریں بستہ پر سے ہٹ کر پھر کوٹ پر جم گئیں ـــ دونوں بھائی بالکل ایک
لباس میں اس طرح اس کے قریب آتے جا رہے تھے ـــ جیسے دو ننھے فرشتے دنیا ۵۴
کے سفر پہ گامزن ہوں ـــ ایک بار پھر اس کے کوٹ کی خواہش بھڑکی ـــ صرف ایک کوٹ ـــ اف کتنی جیبیں ہوتی ہیں ـــ پانچ اور چھ ـــ کاش وہ ایک کوٹ پہن سکتا ـــ اس میں سب کچھ بھر لیتا ـــ پنسل. قلم. روپیہ، پیسہ، کاغذ رومال ـــ اور اپنی پسندیدہ مونگ پھلی بھی ـــ اور وہ یہ سوچتے سوچتے گھر کے دروازے میں داخل ہو گیا ـــ پھٹے ہوئے رومال میں پھٹی ہوئی کتابیں، ایک طرف ٹانگ دیں ـــ اور خاموش ٹوٹے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا ـــ چرچر کی آواز کے ساتھ اس کی ماں نہ جانے کہاں سے نکل آئی۔

"اٹھ کھانا کھا لے" ـــ وہ چولھے کی طرف مڑ گئی. کالی بدبودار کوٹھری جس میں جگہ جگہ جالے لگے تھے ـــ یہ ایک ہی کوٹھری اس کا مکان تھا ـــ

جہاں پلنگ، بستر، کپڑے، چولہا اور سب ہی کچھ تھا۔ لیکن اس کو اس وقت صرف دو بچے بستر میں سے اترتے ہوئے نظر آ رہے تھے ——— برتنوں کے ٹکرانے کی آواز ہوئی اور پھر ہوا میں آہستہ آہستہ تحلیل کر گئی ۔ ——— بالکل اس طرح جیسے ہندو مسلم فساد ہو گیا ہو اور کسی زخمی کی کراہتی ہوئی آہ فضا میں کھو جائے ——— ماں کے دوبارہ کہنے پر وہ غیر ارادی طور پہ کھانے کے سامنے جا بیٹھا ——— !؛

"بڑا لاٹ صاحب بنا ہوا ہے۔ اسے کھاتا کیوں نہیں ——— ؟ کیا سوچ رہا ہے۔
——— اپنی ماں کے روز روز کے رویہ پر اس کو ——— تکلیف پہونچتی تھی۔
وہ کبھی بھی اس کو اسکول میں داخل کرانے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جس کے باپ دادا ہمیشہ مزدوری کرتے ——— جھڑکیاں کھاتے ——— بھوکے اور ننگے رہتے
چلے آتے ہیں ——— وہ کبھی بھی تعلیم کی چادر اوڑھ کر قلم دوات سنبھال ہی نہیں ۵۳
سکتے ——— وہ اپنے شوہر کے اس خیال کی کبھی بھی حامی نہ تھی کہ وہ چُنو کو تعلیم دلوا کر بابو بنائے، ——— وہ اکثر سوچا کرتی تھی یہ بیکار پیسہ ضائع کرتا ہے ——— اور اگر چنو اپنے باپ کے ساتھ مزدوری پر جائے تو آٹھ آنے یومیہ ہی کمالائے گا اور اس کے اسی حساب سے آٹھ آنہ یومیہ کی مزدوری ماری جا رہی تھی یعنی پندرہ روپے ماہوار ——— اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اس اکلوتے بچے سے بھی بغیر جھڑکے بات ہی نہ کرتی ——— لیکن آج اس کی ماں کے رویے اُس کو کوئی تکلیف نہ پہونچا سکے ——— وہ تو یہی سوچتا رہا ——— ابا جی سے کہہ کر ایک کوٹ بنواؤں گا ——— صرف ایک کوٹ ——— جس میں پنسل رکھ کر اسکول جایا کروں ——— اور اس نے دانتوں کے نیچے اپنا نچلا ہونٹ دبا لیا ——— اور سوچنے لگا ——— دنیا بھر کے کوٹ جمع کر کے کاش آگ لگا سکتا۔

بلند شعلوں میں جلتے ہوئے کوٹ ــــ اور پھر اس نے اپنے موٹے کورے کھدر کے کپڑوں پر نظر ڈالی ــــ کورے کپڑے کی قمیض اور اسی کا پاجامہ ــــ قمیض بھی ایسی جس میں کبھی جیب اور کبھی وہ بھی غائب ــــ!

"کیا سوچنے لگا ــــ کھانا کھالے اور بازار سے سودا لادے" اُس کی ماں نے گھنڑکی دی۔

وہ روٹی توڑ توڑ کر دانتوں میں مسلنے لگا۔

"کوٹ کتنے گز میں بن سکتا ہے ــــ شاید چار گز۔ لیکن میں تو چھوٹا ہوں ــــ اگر ابا جی بنوادیں ایک کوٹ تو مزہ آجائے ــــ وہ یہ سوچتے سوچتے مسکرا پڑا اور دوسرے ہی لمحہ اُس کی نظریں سامنے ماں پر اُٹھ گئیں۔ جھکی جھکی خوف زدہ نظروں سے اس نے ماں کو دیکھا ــــ موٹی کالی بھدی۔ اُلجھے ہوئے بال ــــ میلے کپڑے ــــ گردن میں میل ــــ جو مٹاپے کی وجہ سے شکنوں کی صورت میں اور بھی بھدی معلوم ہو رہی تھی ــــ وہ ڈر گیا ــــ وہ کبھی بھی کوٹ بنوانے نہ دے گی ــــ اس کی مسکراہٹ ہونٹوں میں سکڑ کر کہیں غائب ہو گئی ــــ اُس کو محسوس ہوا جیسے اُس کے گلے میں پھندا لگ گیا ہو۔

جب وہ بازار سے سودا لے کر لوٹا تو اُس نے اپنے باپ کو پلنگ پر بیٹھا دیکھا جہاں وہ بیڑی کے دھوئیں کے بادل اُڑا رہا تھا ــــ اُس کی ماں پلنگ کے سامنے دال چُن رہی تھی اور باپ کو دیکھ کر حسب معمول اُس کا جی چاہا وہ مسکرائے۔ لیکن وہ مسکرا نہ سکا۔

"یہاں آؤ بیٹا ــــ" اُس کے باپ نے کہا۔

وہ ماں کے سامنے سودا رکھ کر باپ کے سامنے جا کھڑا ہوا —— بیڑی کا دھواں اُس کے منھ پر چھوڑتے ہوئے باپ نے کہا —— "کیا سوچ رہا ہے ——" اور وہ مسکرا دیا —— باپ کے مسکرانے پر چُنّو بھی مسکرا دیا کرتا تھا۔ لیکن آج خلاف معمول اُس کو خاموش دیکھ کر باپ نے پوچھا "بیٹا کیا بات ہے —— چُپ کیوں ہو —— بلکہ چُنّو نے ایک بار اپنی ماں کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا پھر باپ کی طرف حسرت بھری نظروں سے —— اور باپ سمجھ گیا کہ چُنّو اپنی ماں سے کچھ چھپا کر کہنا چاہتا ہے۔

"اچھا جاؤ بالٹی میں پانی لے آؤ —— اُس کی ماں نے دال چُنتے چُنتے حکم دیا اور وہ بالٹی اُٹھا کر باہر نکل گیا کچھ سوچتا ہوا —— کہہ دوں ابّا جی سے —— بس ایک

۵۶ کوٹ بنوا دو" وہ پھر سوچنے لگا —— میری ماں نہیں بنوانے دے گی۔ اس نے غصّہ میں دانت بھینچ لئے —— جب وہ پانی لے کر واپس لوٹا۔ تو ماں باپ میں کچھ جھگڑا ہو رہا تھا —— باہر رُک کر وہ اُن کی گفتگو سُننے لگا —— باپ کہہ رہا تھا "تم چُنّو کو ہر وقت ڈانٹا کرو —— ذرا آہستہ سے بات کیا کرو —— دیکھو وہ اب خاموش رہنے لگا ہے"

اس کی ماں چڑ چڑا کر —— "میں کہتی ہوں لکھ پڑھ کر وہ خاک کرے گا —— ہر وقت تم اُس کو سر پر چڑھائے رہتے تھے —— تم ہی نے اس کو ستیاناس کر دیا ہے اب بھی میری مانو تو اُس کو اپنے ساتھ کام پر لے جایا کرو۔"

"بس تو تو یونہی دماغ چاٹا کر —— سوچ تو سہی، تین بچوں میں غریب ایک ہی تو بچا ہے۔ تو اس کو بھی مار ڈال —— غریبوں کے بچّے بھی پڑھتے ہیں اور بڑے ہو کر اچھی اچھی تنخواہ پاتے ہیں —— اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ——

اپنا چنّو بھی دیکھ لینا کسی دفتر میں بابو ہو جائے گا ـــــ بابو ـــ تب تو سب کے سامنے اٹھلا کر چلے گی ـــــ بس پانچ سال کی اور بات ہے ـــــ دسواں پاس ہو جاتے بس ـــــ "

"اس کی ماں نے ہاتھ ہوا میں اس طرح اچھال کر کہا۔ گویا کہہ رہی ہے "سوچے جاؤ لیکن وہ کرے گا وہی باپ دادا کی مزدوری "

چنّو پانی کی بالٹی لے کر اندر آگیا ـــــ باپ کی نظریں اس پر جا پڑیں۔ وہ اب بھی انہیں نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے پیاسا ہو شدّت سے پیاسا ـــــ

"آ بیٹا چنّو میرے ساتھ ذرا ـــــ " اس کا باپ باہر نکل گیا ـــــ چنّو بھی پیچھے پیچھے احساسات کا سمندر لئے، جذبات کا طوفان لئے باہر آگیا ـــــ " تو اُداس کیوں ہے کیا پنسل یا قلم کی ضرورت پڑ گئی ؟ " 57

"چنّو کو محسوس ہوا جیسے اس کے حلق میں میرے الفاظ آ کر اٹک گئے ہیں۔ انتہائی کوشش کے بعد بھی وہ اُس کو نگل نہ سکا۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی ـــــ آنکھوں میں ہلکی سی چمک بیدار ہو گئی۔ کنپٹیوں میں دھڑکن سی محسوس ہونے لگی اور ہونٹوں میں پپڑی سی جمنے لگی۔ اس کا سانس گھٹنے لگا ـــــ " نہیں ـــــ ابا جی ـــــ بلکہ ـــــ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں ہاں کہو ـــــ بیٹا ـــــ باپ نے چنّو کی ٹھوڑی کے نیچے اپنی انگلیاں لگا دیں ـــــ اس کو محسوس ہوا جیسے اس کی تمام تھکن، ایک کرنٹ سے دور ہو گئی ـــــ چار انگلیوں میں سے بہتا ہوا کرنٹ ـــــ جس میں محبّت، پدرانہ شفقت کی لہریں شامل تھیں ـــــ حلق میں رُکتے ہوئے الفاظ نرم ہو گئے ـــــ

گلا صاف ہو گیا اور سانس ٹھیک چلنے لگی ——— لیکن چہرے پر سُرخی اور ہلکی گرمی پھر بھی باقی رہی۔

اس نے جیسے کچھ مانگتے ہوئے کہا: "ابا جی بس ایک کوٹ بنوا دو ——— میری جیب سے پنسل اور قلم گر جاتے ہیں" اور اُس نے اپنے باپ کو اس انداز سے دیکھا۔ جیسے کوئی مجرم اپنی صفائی کے بعد فیصلہ سننے کے لئے جج کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا ہو ——— تھوڑی دیر کے لئے باپ خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچنے لگا ——— پھر اس نے مسکرا کر کہا: "اچھا ——— بس پندرہ دن ٹھہر جا ——— ہاں اپنی ماں سے نہ کہنا" اس نے اُس کی پیٹھ تھپتھپا دی۔ چنو کو محسوس ہوا۔ جیسے اس کے اوپر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ——— کوئی نئی چیز مل گئی ——— اور اس کے چہرے کی سُرخی میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہو گئی ——— آنکھیں کشادہ ہو گئیں اور اُس کا جی چاہا کر غوب اُچھلے کودے، دوڑے اور اپنے ہم عمر ساتھیوں کو پکڑ کر پیٹ دے یونہی ——— بس پندرہ دن کی ہی تو بات ہے۔ 58

چنو نے کوٹ کی آستین میں ہاتھ ڈالتے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے اُس کی بغلوں میں گُدگدی ہو رہی ہے۔ عجیب سی مسکراہٹ اُس کے ہلکے گلابی چہرہ سے پھسل کر بہہ گئی۔ پھر اس نے اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ بالکل اس باپ کی طرح جو اپنے بیٹے کی ریڈیو پر پہلی مرتبہ براڈ کاسٹ ہوتی ہوئی تقریر سُن رہا ہو ——— اُس کی نظریں خوشی اور شرم کی دل آویز ملاوٹ سے نیچے جُھک گئیں۔

درزی نے کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے چنو سے کہا: "شاباش۔ اب ٹھیک ہو

یہ دیکھو آئینہ ــــ! اُس نے قد آدم آئینہ میں اپنا مکمل عکس دیکھا ــــ چھوٹے چھوٹے انگریزی بال، ہلکا سُرخ گلابی چہرہ ــــ جُھکی جُھکی چمکیتی آنکھیں ــــ مسکراتے ہوئے باریک سُرخ ہونٹ گلابی چہ خانے کے کھدّر کے کوٹ میں سے سفید کھدّ کی قمیض کا اُبھرا ہوا کالر ــ چھوٹے پائچوں کا پاجامہ اور ایک شکستہ باٹا کی چپّل ــــ وہ خود کو دیکھ کر شرما گیا ــ بالکل اُس دولھن کی طرح، جس کو رخصتی کی صبح منھ دکھائی دی جا رہی ہو ــــ پھر اُس نے اپنے باپ کی طرف جُھکی جُھکی نظروں سے دیکھا۔ بالکل اس دُلھن کی طرح جو اپنی شریر سہیلی کو دیکھ کر شرما رہی ہو ــــ باپ بھی مسکرا رہا تھا فاتحانہ انداز سے ــــ چُنو نے اپنے کوٹ کی جیب میں یونہی ہاتھ ڈال دیا اور ایک بار پھر کنکھیوں سے آئینہ میں اپنا جائزہ لیا ــــ اُس کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ بھی ایک اپٹوڈیٹ بچہ ہے ــــ بس ٹیکسی میں بھاگتے ہوئے بچّوں کی طرح ــــ اُس نے چاروں طرف نظریں گھُما دیں ــــ لوگ گذر رہے تھے ــــ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ سب کی نظریں اُس کے کوٹ میں چپک گئی ہیں ــــ نیا کوٹ، جس میں پانچ جیبیں تھیں ــــ پانچ ــــ!

پھر وہ باپ کے ساتھ کوٹ پہنے درزی کی دوکان سے اُتر آیا ــــ بالکل نئے انداز سے وہ شاید سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اتنے فخر سے سینہ نکال کر چل سکتا ہے ــــ باپ نے اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا ــــ "کہو کوٹ پسند آیا اور اس نے اپنے سر کو اوپر کی طرف جھٹکا دیا آنکھوں اور نتھنوں کے سہارے ــــ بھنویں پیشانی میں گھُس کر واپس آ گئیں۔

"ہاں ــــ بہت عمدہ ــــ لیکن کتنے دام لگے؟" چُنو کی آواز میں شوق

سے زیادہ خوشی کا جذبہ تھا۔

"ارے مجھے کیا ــــ تیری ماں سے روز اسی بات پر تو لڑائی ہوتی رہی۔ کہ میں دام کم دیتا ہوں ــــ بیڑی زیادہ پینے لگا ہوں یا چاء ــــ اور اس الزام کو رکھ کر ایک روپیہ روز بچاتا رہا صرف تیرے لئے" ــــ دیکھ پندرہ روپے کا کوٹ بنا ہے جو تیرے باپ کو بھی نصیب نہیں ہوا ــــ لیکن ہاں اپنی ماں سے کچھ نہ کہنا کہ کتنے روپے میں بنا۔ ہاں آں ــــ باپ نے "آں" کو خوب کھینچ کر کہا۔

"پندرہ روپے میں ــــ!" اس نے تعجب سے باپ کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ سے کوٹ کا کونا ملنے لگا۔

اور رات کو بستر پر لیٹے لیٹے وہ سوچنے لگا ــــ "صبح کوٹ پہن کر جب میں
۶۰ اسکول جاؤں گا تو سب کی نظریں مجھ پر ہی لگ جائیں گی۔ لیکن جیبوں میں کیا رکھوں"
یہ سوچکر وہ اٹھا۔ اپنی پنسل اور قلم بستہ میں سے کھول کر ایک جیب میں رکھ دی۔ "اور اب" ــــ پھر اس نے کاپی کے چند سادے صفحات پھاڑ کر دوسری جیب میں رکھ دیئے ــــ اور وہ پھر بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا ــــ "صبح جب ابا ہی اماں سے چھپا کر اکنی دیں گے تو وہ اندر کی جیب میں رکھوں گا ــــ" کوٹ پر نظریں جمائے وہ لیٹا رہا۔ ہلتا ہوا کوٹ ــــ جیسے کہہ رہا ہو "اتنی جیبیں تو بنوالیں۔ لیکن رکھو گے کیا ــــ کیا خاک ــــ بس ایک پنسل ــــ ایک قلم اور صرف ایک آنہ اور کچھ بیکار کاغذ ــــ اور مہینہ میں ایک بار اسکول کی فیس ڈیڑھ روپیہ لیکن چنو نے ناک چڑھا کر منھ پھیر دیا ــــ اور مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں اور پھر اس کو ایک دم خیال آیا۔ صبح اسکول فیس بھی تو لے جانا ہے ــــ دوسری تاریخ

ہوگئی ہو ستمبر ـــ اور وہ پھر مسکرانے لگا آنکھ بند کئے ہوئے ـــ ڈیڑھ روپے
کے خیال سے جو ایک دن کے لئے رکھنے کو تو ملیں گے ـــ اپنی بھوکی جیب کا
پیٹ تو بھر سکے گا ـــ ایک دن کے لئے ہی سہی ـــ وہ آہستہ آہستہ دل
میں دعائیں دینے لگا اس مبارک تاریخ کو ـــ دوسری ستمبر ۴۶ء ـــ
جب وہ پہلی بار نیا کوٹ پہن کر بازار میں نکلے گا ـــ اسکول جائے گا پیسے جیب
میں بجاتا ہوا ـــ پھر نہ معلوم یہ سوچتے سوچتے کب اس کی آنکھ لگ گئی ـــ
لیکن صبح اٹھتے ہی اس کی نگاہیں خاموش ٹنگے ہوئے کوٹ پر پڑیں ـــ میلی دیوار
پر گلابی اور ساکت کوٹ ـــ جیسے وہ اب بھی سو رہا ہو ـــ گندی اور تاریک کھولی
میں دنیا کے عزائم سے غافل اور تھوڑی دیر بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر اسکول جانے کے
لئے تیار ہو گیا ـــ حسب معمول ـــ باپ نے اس کی جیب میں اسکول کی فیس ٦١
بھی ڈال دی اور خرچ کی اکنی بھی ـــ سب ریزگاری ـــ ایک شام پچیس آنے
ـــ اس کو اپنی جیب میں وزنی اور کھنکھناتے ہوئے سکے ایک نیا لطف دے
رہے تھے ـــ ماں اس کو فخر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھی ـــ لیکن باپ
کہہ رہا تھا ـــ دیکھ کنارے کنارے جانا ـــ اور وہ اچھلتا کودتا سڑک پر نکل گیا۔
ـــ بار بار جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ کوٹ کے کونے میں ارتعاش پیدا کر دیتا
اور کونے میں پڑے ہوئے سکے چیخ اٹھتے ـــ ساتھ ہی اس کا دل خوشی سے اچھلنے
لگتا ـــ چلتے چلتے اس کی نظریں جا پڑیں۔ جہاں ایک کالا جھنڈا لہرا رہا تھا اور اس
کی تائید میں بے شمار کالی جھنڈیاں پھدک رہی تھیں ـــ کالے جھنڈوں، اور
جھنڈیوں کا تسلسل دور تک چلا گیا تھا ـــ اور پھر ترنگے جھنڈے قہقہہ مار رہے تھے

بڑے چھوٹے ـــ کہیں کہیں سفید کپڑوں پر سُرخ اور ہرے حروف "پاکستان لے کر
رہیں گے" ـــ "اکھنڈ ہندوستان زندہ باد" ـــ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے
تھے رقص کر رہے تھے ـــ پھر اس بھری سڑک پر آج اکا دکا آدمی نظر آ رہے تھے ـ
دوڑتے اور بھاگتے ہوئے خوف زدہ، پژمردہ ـــ پولیس قدم قدم پر چکر لگا رہی تھی
ـــ وردی لاریاں پولیس کو لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں ۔ ایک ہیبت ناک
خاموشی ـــ اُداسی ـ بے ڈھنگی کالی وردیوں میں رائفل اور بندوق لئے ہوئے
پولیس مین اس طرح چکر لگا رہے تھے ۔ جیسے اس سڑک پر ان کا قبضہ ہو ـــ
بمبئی اتنا بڑا شہر آج پہلی بار اتنا سنسان نظر آیا ـ جیسے تمام لوگ جنگ پر بھیج دئیے گئے
ہوں ـــ یکا یک اُس کی نظریں سامنے اُبھرتے ہوئے مجمع پر پڑیں ـــ وحشت انگیز
نعرے ـــ اور وہ نہ معلوم کیوں کانپ گیا ـــ اس کی تمام مسرت جیسے وہیں ۶۲
کہیں گر گئی ہو ـــ چہرے کی چمکدار سرخی میں اضطراب پیدا ہو گیا ـــ آنکھوں میں
خون کی وجہ سے بے رونقی آ گئی ـــ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ـــ پھر وہ گھبرا کر
ایکا ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ بھاگا اور سامنے گلی میں بھاگتے ہوئے اُس نے گولیوں کی
آواز سنی ـــ تڑ ـــ تڑ تڑ ـ تڑ ـــ اور پھر انسانی چیخ و پکار ـــ آہ ناقابل
برداشت ـــ وہ سب کچھ بھول کر پوری قوت سے دوڑنے لگا ـــ
بھاگتے ہوئے نالی میں سرخ پانی پر اُس کی نگاہیں دوڑنے لگیں ۔ گول گول سُرخ
بوندیں لہراتی ہوئی بہے جا رہی تھیں کہ یکا یک اُس کا پاؤں پھسل گیا ـــ خون کی
کیچڑ چاروں طرف دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا ـــ پھر سامنے خون میں لت پت پڑی ہوئی
لاش دیکھ کر اُس کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے ـــ کوٹھے میں سے اب بھی

گرم گرم خون جھرنے کی طرح آہستہ آہستہ نکل کر چاروں طرف جمتا جارہا تھا۔۔۔۔۔
مکھیاں ایک دم بھنبھنا کر اڑیں اور پھر ادھر ادھر بیٹھ گئیں۔۔۔ زرد چہرہ، پھٹی ہوئی آنکھیں
اور اندر تک گہرا زخم دیکھ کر وہ کانپ گیا۔۔۔۔ اس کو ایک جھرجھری سی آئی اور
ہوا میں ہلتے ہوئے پتہ کی طرح لرزنے لگا۔۔۔۔ وہ اٹھ کر پھر بھاگا۔۔۔۔ نیم پاگل
اور دیوانہ وار۔۔۔۔ لیکن ایک جھٹکے کے ساتھ وہ رک گیا۔۔۔۔ اس کا ہاتھ کسی
نے پکڑ لیا تھا۔۔۔۔ مضبوط اور آہنی پنجہ میں جکڑا ہوا دیکھ کر وہ روا سا ہو گیا۔۔۔۔
خوفناک مسکراتا اور قہقہہ لگاتا ہوا وحشی چہرہ دیکھ کر اس کا دماغ جیسے ماؤف ہو گیا ہو۔
قبل اس کے وہ کچھ سوچ سکے اس کی پیٹھ میں کوئی چیز سرکتی ہوئی چلی گئی۔۔۔۔ اس
کا سانس حلق میں پھنس گیا۔ سر چکرانے لگا۔۔۔۔ پھر پیٹھ میں سے ایک دم سرخ گرم خون
کا فوارہ ابل پڑا۔۔۔۔ اس کی ایک دردناک چیخ نکل گئی۔۔۔۔ پپوٹے بوجھل ہو گئے۔ ۶۳
اس کو محسوس ہوا جیسے وہ زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔۔۔۔ پھر ایک آواز کے ساتھ
بے ہوش زمین پر گر پڑا۔

جب جنو کو ہوش آیا تو اس کو محسوس ہوا کہ وہ کسی نرم اور گرم بستر پر پڑا ہو۔۔۔۔
ایک عجیب سی بو۔۔۔۔ بدبو اور خوشبو کے امتزاج سے مل کر ہر طرف پھیل رہی تھی
۔۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو اس کو محسوس ہوا جیسے آنکھوں
کے سامنے رنگ برنگ کے ستارے چمک رہے ہوں۔۔۔۔ ہونٹوں پر ایک اذیت
کانپ رہی ہو۔۔۔۔ کمزوری سے اس کا تمام جسم تھرا اٹھا۔۔۔۔ پیٹھ میں اُرکوئی کوئی
کیڑا رینگتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔۔۔۔ جیسے اپنے باریک باریک پنجوں سے کھرچ کرید رہا ہو

اُس کے حلق سے ایک باریک سی کراہتی ہوئی آواز نکلنے لگی ــــ سر چکرانے لگا ــــ اور اس نے تھرتھراتی ہوئی پلکیں کھولیں ــ سفید اور چینی کے ایک لمبے کمرے میں ساٹھ کینڈل پاور کے بلب ایکٹ لائٹ میں یہاں سے وہاں تک چمک رہے تھے۔

ــــ وہ پریشان ہوگیا اس نئے ماحول سے ــ اس نے آہستہ سے اپنی کمزور اور ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "ابّا ــ جی !"

"کیا ہے بیٹا ــ گھبرانا نہیں ــ" باپ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا اور آہستہ آہستہ اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ ڈاکٹر نے جھک کر جلدی سے اس کی نبض پہ اپنی انگلیاں رکھدیں۔

"ابّا جی ــ پیٹھ میں نہ معلوم کیا ہو رہا ہے ــ" چنو نے تکلیف سے
اس حصہ کو اونچا کیا اور اس کو اپنی پیٹھ اور سینہ پٹیوں سے کسا ہوا معلوم ہوا ــ ٧٠

ــ "لیٹے رہو ــ اچھے ہو جاؤ گے ــ" ڈاکٹر نے اُسے دلاسا دیا ــ

چُنو کی نظریں سامنے ٹنگے ہوئے کوٹ میں اُلجھ گئیں ــ گلابی کوٹ، سرخ سیاہی مائل بٹن ــ دیکھ کر اُس کی آنکھیں ذرا اور کشادہ ہو گئیں ــ تجسس سے ــ ایک چار انچ لمبا شگاف جس کے چاروں طرف خون منجمد ہو گیا تھا ــ ٹنگے ہوئے کوٹ میں پڑتے نکلے ہوئے گویا چنو کا منھ چڑھا رہے تھے ــ یا اپنے نئے پن کا مذاق اُڑا رہے ہوں ــ وہ تھوڑی دیر کے لئے تمام تکلیف بھول گیا ہو ــ اور اس نے غمگین آواز میں کہا۔

"ابّا جی ــ میرا کوٹ کس نے کاٹ دیا ــ اتنا بڑا سوراخ ــ میرا نیا کوٹ ــ شگاف دیکھ کر اُس کے آنسو نکل پڑے ــ اپنے اکلوتے کوٹ کا شگاف دیکھ کر ــ لیکن اس کا باپ رو رہا تھا اپنے اکلوتے بیٹے کے شگاف پر ــ !

اُس نے اپنے اوپر ضبط کرتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "بیٹھے رہو بیٹے ــــ نہیں تو ٹانکے ٹوٹ جائیں گے۔"

"ٹانکے ــــــ ! ابو اُس کو محسوس ہوا جیسے اُس کی پیٹھ پر بہت سی چکنی مٹی جم کر سوکھ گئی ہو ــــ پھر اس نے چاروں طرف نظریں گھما دیں ــــ برابر برابر ایک بستر سے دوسرے بستر تک سفید پلنگ اور سُرخ کمبلوں میں ــــ بچے ــــ بڈھے اور جوان چھپے پڑے تھے ــــ سفید اور خونی سُرخ دھبے دار پٹیوں میں ہاتھ، پیر اور چہرے ڈھکے تھے ــــ سرہانے کوٹ ــــ شیروانیاں ــــ قمیض سب ہی توہڑی تھیں ــــ کٹے ہوئے کوٹ ــــ کٹی ہوئی شیروانی ــــ خون میں لت پت ــــ سفید اور چکنی دیواروں میں سے روشنی اس طرح چمک کر پھیل رہی تھی جیسے کرنوں کا فوارہ اُبل رہا ہو۔ ۶۵

"دنگا ہو گیا ہے بیٹا ــــ اب تم سو جاؤ" اس کے باپ نے اُس کے خیالات بٹنے کی کوشش کی۔

"دنگا ہو گیا ــــ" اُس کو خیال آیا ــــ وہی خوفناک چہرہ، قہقہہ مارتا ہوا وحشی انسان "یہ خیال کرتے ہی جھنو کے چہرہ پر سیاہی چھا گئی اور وہ غصہ میں دانتوں سے ہونٹ دبانے لگا "میرا کوٹ کاٹنے والے یہ ہندو، یہ مسلمان ــــ غنڈے بدمعاش ــــ اُس کے چہرہ پر مُردنی کی جگہ غصہ پھیلنے لگا ــــ چہرہ سرخ ہو گیا ــــ نتھنے پھول گئے ــــ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور تمام اعضا میں خون تیزی سی گردش کرنے لگا ــــ مٹھیاں کس کے بند ہو گئیں ــــ رگیں تن گئیں ــــ شریانوں میں دوڑتا ہوا خون کھولنے لگا ــــ وہ اُٹھکر ایکدم بیٹھ گیا ــ پاگلوں کی طرح ــــــــ

یہ سؤر کے بچے ــــ بدمعاش !" اُس کے دانت ٹکرانے لگے۔

ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا: "ارے یہ کیا کیا ــــ!" باپ نے گھبرا کر جلدی سے اُس کو لٹا دیا ــــ لیکن جیتو کو محسوس ہوا جیسے پیٹھ کی سخت مٹی "تڑخ" گئی ہو۔ اُس میں شگاف پڑ گئے ہوں اُس کے مانکے ہلکی سی چٹ چٹ کے ساتھ ٹوٹ گئے تھے۔ وہ چیخ کر بے ہوش ہو گیا۔ بندھی ہوئی پٹی کو خون کے دباؤ نے سرکا دیا۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے سوتا پھوٹ پڑا ہو۔ چہرے پر ایک دم جیسے زردی چھانے لگی ــــ ڈاکٹر نے جیتو کو الٹ کر پوری قوت سے اپنی ہتھیلی اس کے شگاف پر رکھ دی ــــ لیکن ناخنوں کی سرخی ہلدی جیسے رنگ میں تبدیل ہونے لگی۔ انگلیوں پر جھریاں پڑنے لگیں ــــ گلے کی رگیں اُبھر کر نیلی ہو گئیں ــــ ناک سکڑ کر چھوٹی ہو گئی ــــ پلنگ پر خون آہستہ آہستہ پھیلتا ہی رہا
جیتو کی آنکھیں بے نور ہو گئیں ــــ چہرہ کی چمک ایکدم غائب ہو گئی ــــ فضا میں موت ۶۶
کے سائے رقص کرنے لگے ــــ مکھیاں بھنبھنا کر اُڑنے لگیں ــــ ہاتھوں، پیروں اور جسم میں سختی آگئی ــــ کوٹ پر بیٹھی ہوئی مکھیاں اُس کے چہرے پر "چکر" لگانے لگیں ــــ ڈاکٹر نے اُس کے باپ کی طرف مترحم نگاہوں سے دیکھا اور اپنا ہاتھ آہستہ سے اُٹھا لیا ــــ خون میں چپچپاتا ہوا ہاتھ ــــ کوٹ کے شگاف کی مکھیاں غائب ہو گئی تھیں ــــ پلنگ کے نیچے خون کی چند بوندوں پر بھنبھناہٹ ہو رہی تھی اُس کا شگاف منہ کھولے خالی پڑا تھا ــــ

وجدی الحسینی

خونیں اندھیرا

نیا روپ دھارے پھر آئی ہے شاہی
نظر میں ہلاکت، جلو میں تباہی
لبوں پر وہی نغمۂ خیر خواہی
وہی قصۂ کہنۂ بے گناہی
بھٹکنا نہ منزل سے اے میرے راہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

دلوں میں تلاطم، نہ سینوں میں ہلچل
عداوت کے صحرا، کہ نفرت کے جنگل
غلامی کے سائے، غم اور دُکھ کے بادل
رہی بجھکے اب عقل و دانش کی مشعل

ہر ایک سمت عالم میں پھیلی سیاہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

نہ ہے سرفرازی نہ ہے سربلندی
ہوا محو اب جذبۂ دردمندی
دماغوں میں خودبینی و خودپسندی
ہوس کاری و لعنتِ فرقہ بندی

بہت عام ہو ظلمت کم نگاہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

کہاں ہیں وہ مشرق کی اوصاف تمکیں
کہاں مذہبیت کا ہے عقد پروین
نہ صبحِ نگاریں نہ ہے شام رنگیں
اُفق ہند کا ہے شفق رنگ و خونیں

یہ ہے تیری دُنیا کی حالت، الٰہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

سیاست کے ہاتھوں ہو یہ فتنہ کاری
کہ انسانیت خوں میں لتھڑی ہو ساری
محبت کی آنکھوں سے آنسو ہیں جاری
جبینِ وطن ہے وہ داغِ خواری

کبھی دُھل سکے گی نہ جس کی سیاہی

گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی
چمن کھل رہا ہے کہ مرجھا رہا ہے
جو انسانِ گلشن کو بہکا رہا ہے
کوئی غسلِ خونیں میں نہلا رہا ہے
گل و لالہ پر حزن و غم چھا رہا ہے
کہ غنچے بھی لینے لگے ہیں جماہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

بہت کھیل لی آتشِ خوں کی ہولی
بہت تو نے بھر لی گناہوں کی جھولی
گرہ اختلافات کی جس نے کھولی ۷۹
ہے چالاک سرمایہ داروں کی ٹولی
حقیقت سمجھ لے وطن کے سپاہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

دوبارہ ہو پھر سے چمن کی بحالی
بہت ہو چکی بے طرح پائمالی
سجا دے نئے سر سے پھولوں کی ڈالی
سمجھ اس کو، تو ہی چمن کا ہے مالی
ٹپک بن کے اب شبنمِ صبح گاہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

یہاں جو ہے آمادۂ ارتقا ہے
زمانہ نیا اک جنم لے رہا ہے
اُجالا اندھیرے سے جنگ آزما ہے
شگفتِ سحر سے شکستِ جفا ہے

فضا سے بھی اب چھٹ رہی ہے سیاہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

اب ہم انقلابوں کی زد میں کھڑے ہیں
جہاں پاک مقصد کے جھنڈے گڑے ہیں
جہاں حق و باطل کے شیدا اَڑے ہیں
عزائم جہاں موت سے لڑ پڑے ہیں

۷۰ سنبھل کر جسم، اے مردِ رفعت پناہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

ہر اک داغِ نفرت کو دھو کر رہیں گے
یہاں تخمِ اُلفت کے بو کر رہیں گے
سفینہ کو غم کے ڈبو کر رہیں گے
ہوں گو مختلف، ایک ہو کر رہیں گے

یہی ہیں اداؤں، یہی ہیں نواہی
گھٹا بن کے چھایا ہے دورِ تباہی

اِشتیاق عارف!

آزادی سے پہلے

۷۱ کلایو اور ڈینگر ابھی زندہ ہیں۔ ”وردڈکٹ آن انڈیا“ کا مصنف بیورلی نکلس ابھی تک ملک میں موجود ہے ——— برادرکشی کے روح فرسا حوادث کو دیکھکر وہ پھولا نہیں سماتا۔ اِس ڈائری میں وہ آپ کو جابجا خندہ زن نظر آئے گا — اپنوں کی قسمت میں اگر صدیوں تک رونا نصیب ہے تو غیروں کی ذرا مسکرا لینے دیجئے۔

۸ اگست ۱۹۴۶ء !

ہندوستان آزاد ہونے کو ہے، اہاہاہا !!! ———

جارج بہت خوش ہے۔ وہ رواداری کے معاملہ میں حدِ اعتدال سے آگے بڑھ کر پہلے ہی کہتا تھا کہ بین الاقوامی حالات کے پیش نظر ہمیں ہندوستانیوں کے ساتھ دوستوں جیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اب تنگ نظری اور جہالت کا پردہ

اُٹھ چکا ہے۔ یہ لوگ اس جنگ میں غلامی اور آزادی کا فرق محسوس کر چکے ہیں۔ جو ملک دوسروں کی آزادی کی حفاظت کر سکتا ہے۔ جب وہ جاگ اُٹھا۔ تو ہم میں اس کی سیاسی اُمنگوں کو روکنے کی تاب نہ ہوگی۔

...۴۰۰ ملین باشندے آخر کب تک منٹو مارلے اصلاحات پر قانع رہیں گے۔

---

۹ راگست ۱۹۴۶ء ـــــــ !

آج ایروڈرم سے واپسی پر ہم انڈیا کافی ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ جارج میرے برابر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے سڑک خالی دیکھ کر میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ نشیب پر دوڑتی ہوئی جیپ میں ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہوائی جہاز نیچے کو غوطہ کھا رہا ہے ــــــ اگلے چوراہے سے گذر کر مجھے سڑک پر کافی بھیڑ نظر آئی۔ رفتار کو کم کئے بغیر میں نے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک سائکل سوار آہستہ آہستہ جا رہا تھا میرے ہارن بجانے پر بھی اُس نے دھیان نہ دیا۔ ۷۲

"دیکھو جارج! تمہارا ایک ہندوستانی دوست موٹر کے نیچے آنا چاہتا ہے"

"ـــــــ لیکن" اور غصّہ میں میں نے رفتار تیز کر دی۔

اوہ ـــــــ "سلو ڈاؤن پلیز جان!" اُس نے مجھے بازو سے جھنجھوڑا۔ میرے ہوش و حواس برقرار تھے۔ لیکن رُکتے رُکتے بھی سائکل کے پچھلے مڈگارڈ سے گاڑی ٹکرا گئی۔

"یو باسٹرڈ ـــــ" میں اس پر بُری طرح برس پڑا۔

وہ ایک تعلیم یافتہ اور متمدّن شہری نظر آرہا تھا۔

"زبان سنبھالو اپنی ـــــ میں گالیاں نہیں سُن سکتا ـــــ" اُس نے رواں انگلش میں کہا۔

"چوزہ کی طرح ابھی پہیوں میں پھڑپھڑا کے رہ جاتا ـــــ جاہل کمینہ کہیں کا۔"

میں طیش میں گاڑی سے اُتر پڑا ـــــ جارج نے مجھے پیچھے سے آکر پکڑ لیا ورنہ ٹھوکریں مار کر اُسے سیدھا کر دیتا۔

جارج اُسے سمجھانے لگا۔ "میرے ساتھی کا غصّہ کرنا بجا ہے۔ تم بیچ سڑک پر کیوں چل رہے تھے؟ خیال کرو ذرا سی بے پرواہی سے ابھی کتنا بڑا حادثہ ہو جاتا ۷۳
تم تو پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو یہ تو بتاؤ ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی ہے کہ نہیں ـــــ متمدّن شہری ہمیشہ قانون کی پابندی کرتے ہیں۔"

آج پہلی مرتبہ ایک دیسی نے میری گالی نہیں سنی۔ خدمت گاروں کے ساتھ عام بول چال میں بات کو سہارا دینے کے لئے ہم بعض ایسے الفاظ کہہ دیتے ہیں۔ جن کا اصل مفہوم اس وقت ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا لیکن اگر ان کے معنی لے لئے جائیں تو ہماری گفتگو ناشائستہ قرار دے دی جائے۔ مجھے یاد پڑتا ہے ایک مرتبہ ایک کلرک نے کہا تھا کہ آپ کی قوم نہایت شائستہ اور برتر (Superior) ہے لیکن احساس برتری کے باوجود آپ لوگ عام بول چال میں محتاط نہیں ہیں ـــــ ہندوستان سے جب آپ چلے جائیں گے۔ تو یہاں کے لوگ آپ کے اخلاق

کی برائی کریں گے۔

---

۱۰ اگست ۱۹۴۶ء ــــــــ!

اس جنگ سے پہلے یہ لوگ اس قدر بیباک نہیں تھے یا شاید پہلے وہ مافی الضمیر اِتنی صفائی سے بیان نہیں کر سکتے تھے۔ آپس کے ارتباط اور انگریزی زبان کے عام ہو جانے سے اب وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں کہہ دیتے ہیں۔ جارج جس ہندوستانی سے ملتا ہے کرید کرید کر باتیں کرتا ہے۔ ان کی مذہبی اور سماجی رسومات، ان کی طرزِ رہائش اور اُن کے گھریلو حالات کے بارے میں اسے واقفیت حاصل کر کے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ یہ گریٹ اسکاٹ، انگلینڈ جا کر لوگوں سے نہ معلوم کیا کہیگا۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہا جائے۔ ہمیں کیا غرض پڑی ہے۔ کہ ان کے معاملات میں دلچسپی لیں۔ خواہ مخواہ اپنے دماغ کو اُلجھانا ہے۔

---

۱۱ اگست ۱۹۴۶ء ــــــــ!

بوس کا نام سنتے ہی میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ برما سے لیکر کوہیما اور امپھال کے محاذ پر جتنے انگریز ہلاک ہوئے ہیں۔ اُن سب کا یہ قاتل ہے۔ ہمارے کیسے کیسے تنومند جوان اس شخص کی انتقامی کارروائیوں میں ختم ہو گئے۔

آج کافی ہاؤس میں حسبِ معمول میری اور جارج کی بحث چل رہی تھی۔ میں اس سے کہہ رہا تھا: دیکھو جارج! ہمقوم ہونے کی حیثیت سے میں تمھیں کئی بار سمجھا چکا ہوں۔ کہ تم ہندوستانیوں سے اتنی دلچسپی نہ لو ـــــ تم نہیں جانتے۔ مجھے کتنی تکلیف پہونچتی ہے

جب میں تمھیں ان لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھتا ہوں تم جیسوں
نے انھیں منہ لگا کر ڈھیٹ کر دیا ہے۔ اب سینما میں ہمارے بڑے بڑے افسروں کو دیکھ کر
یہ مفلس راستہ نہیں دیتے۔ پہلے قریب آتے ہوئے لرزتے تھے۔

(Don't be so rash)
وہ جواب دیتا ہے: مائی ڈیر پال ۸ اب ہمیں بے جا غصّہ، تعصب اور جوش
کو مغلوب کر دینا چاہیے۔ تم جس زاویہ سے پوزیشن کو دیکھ رہے ہو۔ وہ سراسر غلط ہے
کیا سائینٹفک ترقی کے اس دور میں حق پسندی، انسانی خلوص اور محبت ایک مبہم
نصب العین ہو کر رہ گیا ہے؟ قطع نظر اس کے، ہماری پرانی نسل نے اس ملک کے
لوگوں کے دلوں میں نفرت کے دھبے ڈال دیئے ہیں میں دیکھتا
ہوں کہ انگلینڈ اور ہندوستان کے تعلقات تادیر ایسے نہیں رہیں گے ان میں
کافی تبدیلی ہو چکی ہے آج کے تعلقات کی بنیادوں پر کل کے اتحاد کا انحصار ہے 75
نئی پود کو ان کے شبہات جلد از جلد دور کر دینا چاہئیں۔ ورنہ نفرت سے ان کے دل سیاہ
ہوتے جائیں گے۔ اور انھیں نئے اور پرانے انگریزوں میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا"

میں کہتا ہوں "میرا گمان صحیح ہے کہ تم جیسے آزاد خیال جوان کلایو اور
ہیسٹنگز کی جانفشانیوں پر پانی پھیر دیں گے آج تم انھیں برا کہہ رہے ہو جنھوں نے امپائر
کے تاج میں اقبال مندی کے ہیرے جڑے ہیں انھوں نے تمہارے لئے
دنیا کی سب سے بڑی سلطنت ورثے میں چھوڑی ہے۔ تم اسے پسند کرو گے کہ ہم
میں ہر پانچ آدمی میں سے ایک آدمی بھوکوں مر جائے۔ ہندوستان سے ہمدردی
جتاتے وقت اسے مت بھولو"

ہم ٹھہر ٹھہر کر کافی کے ٹھنڈے ٹھنڈے گھونٹ لیتے رہے۔ بحث بدستور

جاری رہی۔

"میں تو اس دن کا منتظر ہوں ۔۔۔۔" اس نے سگریٹ کے لمبے کش سے پھیپھڑوں کو فرحت پہونچاتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ "جب ہم سلامتی سے ہندوستان کے ساحل کو چھوڑ رہے ہوں گے۔ انڈونیشیا، برما، مصر اور فلسطین کی تحریکوں سے انگریزی فوجوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں اس کے اثرات ضرور پڑیں گے اور خدا نہ کرے ہم وہ دن دیکھیں جب یہ ملک بھی ہمیں باہر نکال دینے کا عزم کر لے۔ تم عام حالت میں انھیں دیکھ کر یہ خیال کرتے ہوگے کہ بڑے سیدھے اور بردبار ہیں یہ لوگ لیکن اشتعال کے عالم میں یہ بے انتہا خوفناک اور پاگل ہو جاتے ہیں۔ میں فرنٹ لائن پر ان کے طیش کو دیکھ چکا ہوں۔ اس بارے میں مجھے کچھ تم سے زیادہ تجربہ ہے۔"

کافی ہاؤس میں چار ہندوستانی نوجوان داخل ہو رہے تھے۔ وہ انھیں دیکھنے لگ گیا اور بات ادھوری رہ گئی۔ ۷۷

وہ لوگ بیچ کی ٹیبل کے گرد کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ اس طرف ہم لوگ تھے اور پرلے سرے پر لفٹیننٹ لی، کیپٹن موریس اور اس کی لیڈی ۔۔۔۔!

"چار سال کی طویل مدت گذر گئی ہمیں انڈیا کمانڈ میں کام کرتے ہوئے ۔۔۔۔" اس نے دھیمے لہجہ میں اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ "تم ہی بتاؤ جان ۔۔۔۔! ایکٹیو سروس سے تم کتنے اُکتا گئے ہو ۔۔۔۔ اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور حسین سرزمین انگلستان کی یاد میں، ہمارے دلوں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس یاد کو تمناؤں کا سہارا دیتے ہوئے ہم بوڑھے ہو جائیں گے اور شاید یہیں مر کھپ جائیں وطن کی یاد آتے ہی ہم بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔

چاروں ہندوستانی بے تکلف دوست نظر آ رہے تھے وہ آپس میں باتیں کرتے کرتے کبھی کنکھیوں سے ہماری جانب دیکھتے اور پھر اپنی لاتعنابی گفتگو میں حصہ لینے لگ جاتے۔ انھیں آئے ہوئے اندازاً دس منٹ ہو چکے تھے۔ لیکن لالچی بیرے اُن کی ٹیبل کی طرف رُخ نہیں کر رہے تھے۔ صاحب لوگوں کی بخشش سے اُن کی اُمیدیں بندھی ہوئی تھیں غلیظ انھیں کیا دیتے۔

اب ان لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا ٹیبل ڈرم بن گئی تھی اور وہ سب اُسے پیٹے جا رہے تھے ــــ ان کی اس بدتمیزی سے مجھے کوفت ضرور ہو رہی تھی مگر وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ کیونکہ انھیں بُری طرح احساسِ کمتری ہو رہا تھا ان کی چیخ پکار سے کیپٹن موریس کی بھنویں تن گئیں۔ رہے خود سے زیادہ اپنی لیڈی کی دماغی پراگندگی کا خیال تھا۔ لفٹیننٹ لی بھی قدرے اَپسٹ ہو گیا تھا۔ "

آخرکار ایک ہندوستانی جرأت کر کے اُٹھا اور انتہائی غصے کے عالم میں منیجر سے جا کر اُلجھ گیا!

"کیا بات ہے جی، یہ آپ کے مُلازم ہماری طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"دوسری طرف مصروف ہوں گے۔ اس لئے آپ کی خدمت کرنے میں دیر ہو گئی۔ آپ جا کر بیٹھئے میں ابھی کسی کو بھیجتا ہوں" ــــ منیجر نے تخب ارتی انداز میں اُسے جواب دیا۔

"آپ دیکھتے نہیں ــــ وہ ان انگریزوں کی خوشامد میں لگے ہیں" اس نے ہم لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک تیکھی نظر ڈالی ــــ اور بہت ہی

برافروختہ حالت میں واپس آکر بیٹھ گیا۔

اب ان لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ ہندوستانی میں بات چیت ہو رہی تھی، اس لئے ہم لوگ کوئی مطلب نہیں نکال سکے۔ ایک جگہ دوران گفتگو میں ان لوگوں نے کئی بار، انڈیا کافی ہاؤس اور انڈین کافی ہاؤس کا لفظ استعمال کیا۔ میری روح میں چنگاریاں لگ گئیں —— یہ شیطان کے بچے کہنا یہ چاہتے تھے کہ انڈین کافی ہاؤس میں انگریز کیوں داخل ہوتے ہیں (Dogs are not allowed) کی طرح وہ یہاں (Tommies are not allowed) کی تجویز پر غور کر رہے تھے۔ ان بڈّیوں کے ڈھانچوں کو ہمارا مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ آگیا تھا۔ جیسے ہم دنیا کے مالک ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں میں غلام کا درجہ رکھتے ہیں۔

"بوس —— بوس ——" وہ سب بات کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے ۷۸
پکار اٹھے۔ برداشت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان کے پرخچے اڑا دوں۔ اس وقت بوس کو ہیلو کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ اپنے شیطانی عزائم میں کامیاب ہوگیا ہوتا تو اس جگہ سفید چمڑی نظر نہ آتی۔

---

۱۵ اگست ۱۹۴۶ء ——!

آجکل اخبارات میں ڈی ڈے کی طرح ڈائرکٹ ایکشن ڈے کا بہت زور شور سے پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں اس کی نوعیت کیا ہوگی؟

صبح بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بتایا گیا تھا کہ شہر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے کسی وقت بھی غیر یقینی حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ فوجی حکام بہت چوکنا نظر آتے ہیں۔ ان کی خاموش

سرگرمیاں کسی طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی ہیں۔

سہ پہر کو کیمپ ہاسپٹل میں ڈاکٹر اشرف مجھے مل گیا تھا۔ میری طرح وہ بھی حالات سے بے خبر تھا۔ کہنے لگا: اتنے بڑے ملک میں ہنگامے ہوتے ہی رہتے ہیں —— کوئی جلوس نکلنے والا ہوگا پولیس کمشنر نے ملٹری اتھارٹی کو احتیاطاً اطلاع دے دی ہوگی اس میں تردد کی کیا بات ہے ؟؟

اندر ہی اندر جو خدشہ بڑھتا جا رہا تھا اُسے میں چھپا گیا۔

کسی رسمی جلوس سے ملٹری اتھارٹی کو کیا سروکار ہے؟ —— حفاظتی اقدامات کی تہہ میں کوئی بات ضرور ہے۔ چند ماہ قبل بمبئی میں ملاحوں نے بغاوت کر دی تھی۔ اس کے بعد سے فوج میں بڑی رازدارانہ احتیاط برتی جاتی ہے۔ کہیں یہ پیش بندی اسی سلسلہ میں تو نہیں کی جا رہی۔ بظاہر تو اس قسم کے مجنونانہ مقابلہ کا کوئی امکان نہیں ہے 79
آجکل ہندو مسلم کشیدگی بڑھ گئی ہے۔ کیا معلوم اس کے دور رس اثرات فوج پر بھی پڑیں —— اس ملک میں روسی تصورات سے بھی خاص طور پر دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بمبئی کی بغاوت میں کمیونسٹ عناصر در پردہ کام کر رہے تھے۔ پچھلے دنوں ان لوگوں نے ایک اہم فوجی راز کو افشا کر کے ملک میں بڑی سنسنی پھیلا دی تھی۔ حکومت گورکھوں کو ملکی تحریکات کے خلاف استعمال کرنا چاہتی تھی لیکن اب وہ فرائض کی انجام دہی میں دانستہ کوتاہی برتیں گے۔ کیونکہ ساری تجویز کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ اضطراب وہل چل کو روکنے اور سیاسی عنصر کو کچلنے کی فوجی اسکیم سے باخبر ہو کر ہندستانیوں کا جذبۂ نفرت اور ترقی کر گیا ہے۔

کمیونسٹ بڑے خطرناک ہیں —— یہ برطانوی شہنشاہیت پسند جمہوریت

اور ہندوستانی خود مختار جمہوریت دونوں کے دشمن ہیں اور دن رات ہمیں بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دینے کی فکر میں لگے ہیں۔ جس جگہ ان کا اثر بڑھا۔ وہیں امن غارت ہو گیا۔ بڑا بدنصیب ہے وہ ملک جہاں ان کے قدم پڑ جائیں۔

---

۱۸ اگست ۱۹۴۲ء ——— !

آج بے حد تھک گیا ہوں۔ کام کے غیر معمولی دباؤ سے اعضا شکنی ہو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بہت سی برانڈی پی کر کئی دنوں کے لئے سو جاؤں ——— اور جب تک تھکے ہوئے اعصاب بستر پہ پڑے پڑے حرکت کرنے کے لئے خود نہ اکسائیں اس وقت تک سوتا رہوں۔ لیکن مجھے تو ڈر ہے کہ پچھلے تین دن میں جو کچھ دیکھا ہے۔ اس سے
عالم خواب میں بھی چھٹکارا پانا دشوار ہے ——— یا الٰہی یہ سوتے جاگتے کے ۸۰
خواب ——— !!!

کل صبح ہماری پوری یونٹ پھر دم میں کمانڈنٹ کی ہدایت کے بموجب مکمل جنگی لباس (Battle Dress) پہنے کوارٹر ماسٹر کے دنتالا میں کھڑی تھی۔ چند ہم لپسند جوان اس امید میں تھے کہ میدان جنگ میں مستعدی دکھانے اور مد جان جوکھوں میں ڈالنے کا کوئی صلہ ملنے والا ہے بہت سے (Home Sick) یہ سمجھ کر کہ گھر واپس جانے کی خوشخبری سنانے کے لئے یہ ڈیمانسٹریشن کیا گیا ہے۔ قبل از وقت منصوبہ بندی میں بھڑے ہوئے تھے اور تجربہ کار سپاہی کسی ناگوار فرض کی انجام دہی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے کہتے ہیں دروازے کا پردہ ایک طرف کو سرکا کر کمانڈنٹ کے اندر آنے سے پہلے ہی اس کے بیاہ دار نش گئے ہوئے اخروٹ کے

پائپ کی جھلک دیکھ کر جوانوں کے سینے تن گئے۔ کمانڈنٹ ہمیشہ کی طرح ایک بے قاعدہ مگر حوصلہ مند مسکراہٹ لئے ہوئے ہمارے سامنے تھا۔ یہ مردانہ مسکراہٹ کبھی کبھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن اس میں اتنی کشش ہے کہ کمانڈنٹ کا نام آتے ہی سب سے پہلے ہمیں اس کی مسکراہٹ کا خیال آتا ہے۔

ڈائس پر سے اس کی بارعب آواز سنائی دی: بوائیز! فرقہ وارانہ ہنگاموں نے شہری نظم ونسق کو معطل کر دیا ہے۔ حالات پولیس کے قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ سول اتھارٹی نے قیام امن کے لئے ہم سے فوجی امداد مانگی ہے ——

وہ تھوڑے وقفہ کے لئے ٹھہر گیا۔ شاید مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا ——

اب چند گھنٹوں کے اندر اندر تم لوگ پولیس کا چارج لے لو گے۔ وہاں تم لوگوں کو میدان
جنگ سے مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ شہری بدنظمی کو ۸۱
فوجی طاقت سے دبانا نہایت گندہ فعل ہے تاہم مجھے تمہاری اعلیٰ تربیت اور رعشدہ صلاحیتوں پر اعتماد ہے کہ تمہیں جو کام بھی سونپا جائے گا۔ اسے نہایت عمدگی اور ہوشیاری سے انجام دو گے۔ میں یہاں خاص طور پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہتھیار استعمال کرنے سے پہلے اس بات کا لحاظ رہے کہ تمہاری زد پر مسلح دشمن نہیں ہے بلکہ بھڑکے ہوئے شہری ہیں جو کل تک امن کے اصولوں پر چل رہے تھے۔

کمانڈنٹ کے خاموش ہوتے ہی جوانوں کی نگاہیں ایک دوسرے چہرے پر پڑیں۔ جیسے وہ ایک دوسرے کی قوت برداشت اور مایوسی و نامرادی کی انتہا کا کوئی صحیح اندازہ لگانا چاہتے ہوں۔ بیس منٹ بعد جنگی مظاہرہ شروع ہو گیا۔ بارکوں کی پشت پر شہر کو جانے والی سڑک پر ہلکے ٹینکوں اور لائٹ انفنٹری

کی گاڑیوں سے سجی ہوئی تھی۔ ان کے پیچھے ہماری میڈیکل پارٹی تھی اور سب سے آخر میں ملٹری پولیس کا موٹر سائکل سوار دستہ حرکت کر رہا تھا۔

شہر کے نواحی علاقہ میں داخل ہوتے ہی بھیانک ویرانی نے ہمارا استقبال کیا۔ سڑک کے دونوں جانب مزدور پیشہ لوگوں کی جھونپڑیاں ہماری جانی پہچانی تھیں جب ہم یہاں سے گذرتے تھے۔ تو چھوٹے چھوٹے برہنہ بچے اپنا کھیل چھوڑ کر ہماری اجنبی وضع قطع کو دیکھنے لگ جاتے تھے اور ان کی مائیں بہنیں ہماری وحشیانہ نگاہوں سے بچنے کے لئے منہ پر اوڑھنیاں ڈال لیتی تھیں۔ اس روز ہمیں کوئی بچہ نظر نہ آیا۔
——— ان کی مائیں اور بہنیں بھی شاید کہیں منتقل ہو گئی تھیں۔ پھوس کی جھونپڑیوں میں زندگی کے آثار ناپید ہو چکے تھے۔ زیادہ تر راکھ کا ڈھیر بنی پڑی تھیں
اور جو تباہی سے بچ گئی تھیں۔ ان کے سامنے گرہستی کا سامان بکھرا پڑا تھا ——— 82
شکستہ پلنگ۔ پیتل کے ظروف اور دو تین پرانی جھاڑو ——— ایسا نظر آتا تھا کہ دشمن نے عجلت میں اس علاقہ کا صفایا کر دیا ہے۔ جاپانی فوجیں پسپا ہوتے وقت ہمارے لئے اسی قسم کے مناظر چھوڑ جاتی تھیں۔

شہر کی بلند و بالا عمارتوں کے درمیان ہمارے ٹینک تیزی سے گزر رہے تھے کہیں کہیں کھڑکیوں کی آڑ میں کوئی دہشت زدہ شہری جھانکتا ہوا دکھائی دیتا، اور فوراً ہی سہم کر دبک جاتا تھا۔ سنسان گلیوں میں ویرانی خود ویرانی سے ہمکنار تھی۔ ایک جگہ چار پولیس مین اس طرح کھڑے تھے۔ جیسے انھیں اپنے وجود کا احساس ہی نہ ہو، یا کسی "جہنمی فرشتہ" کو دیکھ کر انھوں نے اپنی حالت قابل رحم بنالی تھی۔ قریب کی ایک سہ منزلہ بلڈنگ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود تھے

اندر سے لوگ وحشیوں کی طرح چلا رہے تھے اور وہ چاروں پولیس مین اپنی جگہ پر چپ چاپ کھڑے شاید یہ سوچ رہے تھے کہ مصیبت زدوں کی مدد کرنا زیادہ ضروری ہے یا کسی محفوظ گلی میں گشت لگانا ——— !

آگے بڑھ کر ہم کٹی ہوئی لاشوں اور سسکتے بلکتے کراہتے ہوئے زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔

کمزور مقصد کے ماتحت جو کشمکش ہوتی ہے۔ اس میں طاقتور عنصر کو نقصان نہیں پہونچتا۔ اس بے تحاشہ خون ریزی میں بے بس بوڑھی نسل، معصوم بچوں اور بے زبان عورتوں سے اپنے بہیمانہ انتقام کی آنچ کو سرد کرنے کے لئے ہر شخص اس یقین کے ساتھ بھرا ہوا نظر آرہا تھا کہ جیسے آج قانون وانصاف کے آگے سرنگوں ہو گیا ہو۔ آج شہری اپنے مکانوں کو نذر آتش کر رہے تھے اور غنڈے سارے شہر ۸۳
کو خون میں نہلا دینا چاہتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ جارج کو کہاں تعینات کیا گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے اس وقت مل جائے تو میں اُسے بتاؤں کہ ان آنکھوں نے کیسے دل گداز مناظر دیکھے ہیں ——— میرے دل میں ایک طرح سے خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ کیونکہ اس کی آدرش خیالی اور انسانی ہمدردی اب اس منظر میں پھیل گئی تھی۔ میرا دوست پشیمان ہو گا تاسف کے عالم میں آج وہ کچھ نہ کہیگا۔ اس کے آئیڈیل کو صدمہ پہونچے گا۔ پہلے وہ مجھے سیاسی درس دیا کرتا تھا۔ آج میرے تصورات کی فتح ہوئی ہے۔ میں اسے سبق دوں گا۔

چار بجے کے قریب مجھے بینک کی حفاظت پر لگا دیا گیا۔ جارج وہاں پہلے سے موجود تھا۔ مجھے بشاشت دیکھ کر ایکدم اس پر انفعالی کیفیت طاری ہو گئی۔ تاہم میں

پچھو کے لگنے سے باز نہیں آیا۔
"یہ کہو یار — سراج الدولہ کی فوجوں کو شہر کی طرف بڑھتے دیکھ کر انگریز
تاجروں نے دیسی آبادی پھونک دی تھی۔ جب ہندوستان غلام بن رہا تھا —
— آج ہندوستان آزاد ہو رہا ہے تو دیسی، دیسی کو پھونک رہا ہے —
کیسی عجیب بات ہے — ؟ یہ وہی سرزمین ہے جہاں تین سال قبل چار لاکھ غلام
بھوک سے مر گئے تھے — کون کہتا ہے کہ یہ خطہ تباہ ہو گیا ہے —
— آج خونی چھینٹوں سے وہ اپنی صحت مندی کا اعلان کر رہا ہے —
آج اس نے دنیا کی زبان پکڑلی ہے —"
"جان — اس وقت مذاق نہ اڑاؤ — جب کہ فنا و بقا میں کش مکش جاری
ہے — اُجالا — اندھیرے میں — اور موت — زندگی کی آغوش میں 84
پہونچ رہی ہے — عرصہ سے دو ناسور ایک ساتھ بہہ رہے تھے۔ دونوں کا رُخ
متوازی تھا۔ پیپ جمع ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے آج راستہ ڈھونڈھ نکالا —
اس وقت دو متضاد نظریئے، دو مخالف فرقے اور دو مختلف کلچر متصادم
ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کش مکش سارے ملک میں (Anarchy)
نراج پھیلا دے۔ پھر کیا ہوگا —" "ہنسو مت ذرا سنجیدہ بنو — تاج کا سب
سے بیش بہا ہیرا خون میں لتھڑ جائے گا — اس قسم کی سیاسی اور سماجی
بدنظمی کے ساتھ ساتھ ہمارا قومی مفاد کو نقصان پہونچے گا
ہم میں ہر پانچ آدمیوں میں سے ایک آدمی بنگالیوں کی طرح فاقہ کا شکار ہو جائیگا
تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے"

ہم لکڑی کے تختے پر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہتے ہیں۔

سامنے کی گلی میں شور مچا ہے۔ فسادی توڑ پھوڑ اور قتل و غارت گری میں مشغول ہیں۔ دس بارہ آدمی لاٹھیوں اور لمبے چاقوؤں سے مسلح نکڑ والی بلڈنگ پر دھاوا بول دیتے ہیں۔

"یہ حرام زادے باز نہیں آئیں گے ——" وہ اپنی ٹامی گن سیدھی کر لیتا ہے۔

تم سمجھدار انگریز ہو۔ اس قسم کی کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا —— ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیئے —— انھیں جی کھول کر جشن آزادی منا لینے دو ان کا ملک آزاد ہو رہا ہے"

فسادی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جاتے ہیں!

"جان تم مجھے مت روکو، میں اپنی آنکھوں کے سامنے یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا" وہ پھر بپھر اٹھتا ہے۔

"میرے یار —— تم بینک کی حفاظت کر رہے ہو ——
قیام امن کے جو لوگ ذمہ دار ہیں انھیں روکنے دو یہ ہنگامے ——"

ایک عورت بھاگ کر چھجے پر آگئی۔ فسادی بزور اس کے بچے کو چھین رہے ہیں۔

بچے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ایک شخص آگے کو بے رحمی سے کھینچ رہا ہے اس کی ماں دونوں ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے دیوار سے ٹک جاتی ہے لرزاں و ترساں —— اس کے ہاتھ سے بچہ چھوٹ جاتا ہے!

دوسرے لمحے ہیں کوئی چیز اوپر سے نیچے کو گرتی ہوئی نظر آئی۔ ٹرک پر بچے کا جسم ریشہ ریشہ ہو گیا۔

جابج پر دیوانگی طاری ہو جاتی ہے وہ نشانہ لینے لگتا ہے۔

"جابج کیا کرتے ہو ——— تم تو ان لوگوں کے ہمدرد ہو ——— "

میں اس پر بھروسہ کرتا ہوں۔ ٹرررررر ——— ٹھک ———

اس نے پوری باڑھ جھونک دی۔

پیچھے پر وہ عورت اور تین فسادی ڈھیر ہو گئے۔

مشترک خوف اور مشترک نفرت کا ایک ساتھ خاتمہ ہو گیا۔

پاور پالٹیکس زندہ باد ———!!!

جاوید

دھرتی کے آنسو

دھرتی کے آنسو نکل پڑے
دُکھ کے سوتے اُبل پڑے

بہتے نکلی نینوں سے دھارا
دُکھ ساگر کا کون کنارا
ہر سو چھایا گھُپ اندھیارا

آشاؤں کے دیپ جلا کر
لو بجھ کے بندو! پیت جگالو

دھرتی کے آنسو......
دیش کے بالک بھائی بھائی

لالچ

بند کرو آپس کی لڑائی
کاٹو گلا نہ بھائی کا بھائی

چھوڑ کے من سے کپٹی باتیں
سب سے ملنے کی سوگند کھا لو

دھرتی کے آنسو!!!!! ....
پریت ہی دھ پریت ہی بھگتی
پریت ہی نل پریت ہی دمنتی
پریت میں مکتی، شکشا، شکتی

مورکھ بندو! پریت کی جگ میں
۸۸ جوت جگا لو، دیپ جلا لو

دھرتی کے آنسو نکل پڑے
دکھ کے سوتے اُبل پڑے

کپٹ، کینہ۔ دشمنی حسد راجہ نل راجہ نل کی بیوی نجات، چھٹکارا۔
علم، تعلیم طاقت، ہمت، حوصلہ!!!

انجم سلمانی

اُلّو

اُس کے گالوں پر یکبارگی ہلکی سی سُرخی اُبھری اور کان کی لَو تک پھیل گئی ___ ۸۹
آنکھیں چمکنے لگیں ___ بدن کی تمام رگوں میں تناؤ پیدا ہو گیا ___ اور اُس نے اپنی چھاتی تان کر دل میں سوچا ___ ہاں ٹھیک تو ہے ___ آخر یہاں ___ اس اُجاڑ جنگل میں رکھا ہی کیا ہے ___ جدھر جاؤ میلے کچیلے چھیچھڑے اور مٹی و گوبر میں لتھڑے ہوئے ڈھانچے دکھائی دیتے ہیں اور یہ کیفیت ___ مگر ان کمبختوں سے نہ معلوم کیوں اُسے بیحد محبّت تھی ___ وہ جب بھی سوچتا کہ آخر کب تک وہ اپنے بوڑھے باپ کے سر لگا رہیگا۔ اُسے خود الگ کوئی کام دھندا تلاش کرنا چاہیئے۔ تو لے دے کر اس کی نظر شہر پر پڑتی اور فوراً اُسے اپنے ایک بچپن کے ساتھی رادھو کا خیال آجاتا۔ جو شہر میں جا کر ایک صاحب کے یہاں ملازم ہو گیا تھا اور باغیچہ میں رکھے گملوں کو پانی دیا کرتا تھا۔ مگر وہ اب صاحب کے یہاں چوکیدار تھا اور ہمیشہ سفید دودھ

جیسی وردی پہنے صاحب کے بنگلے پر کھڑا رہتا تھا ـــــ اور اسی طرح وہ بھی چاہتا
تھا کہ شہر میں جاکر کسی صاحب کے یہاں نوکر ہو جائے اور جب بھی اس نے ایسا ارادہ
کیا اور شہر جانے کی تیاری شروع کی۔ تو ایک لمبے عرصہ کے لئے گاؤں چھوڑنے کے
خیال سے اس کا دل بیٹھنے لگا ـــــ بدن میں جھرجھری پیدا ہو گئی ـــــ
اور لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھ کر اس کی ـــــ بھیگ گئیں ـــــ
کیسے خوبصورت تھے یہ کھیت ـــــ اس نے دنیا میں ہوش سنبھال کر سب سے پہلے
انہیں ہی دیکھا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ ہمیشہ انہیں ہی دیکھتا رہے ـــــ مگر
اب وہ پورے بیس سال کا ہو گیا تھا اور اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ضرور شہر میں جاکر
نوکری کرے گا اور اپنے بوڑھے باپ کے پاس نقد روپے بھیجا کرے گا ـــــ
بالکل اس طرح جیسے رادھو اپنی ماں کے پاس بھیجا کرتا ہے ـــــ مگر رادھو کی ماں ۹۰
کیسی زبان دراز اور پھوہڑ ہے کہ روپے پا کر بھی اپنے بیٹے کو کوستی رہتی ہے ـــــ
اور اُس کا باپ تو بہت سیدھا سادھا انسان ہے ـــــ آج تک کبھی اس نے اس سے
کسی کام کے لئے نہیں کہا۔ البتہ وہ اپنے جوان منموہن بیٹے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا
کرتا تھا اور دوسروں کے سامنے اُس کی تعریف کیا کرتا ـــــ مگر اب تو خود اسے دوسروں
کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو اپنے ماں باپ کے ساتھ کام کرتے دیکھ کر اپنے بیکار وجود پر
شرم سی آنے لگی تھی اور اس نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ ضرور شہر جاکر کسی صاحب
کے یہاں کام کرے گا اور اگر ہو سکا تو اپنے بوڑھے باپ کو بھی وہ اپنے پاس ہی بُلا لے گا
ـــــ اور اس کے اس ارادہ کی خبر نہ معلوم کس طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔

ارے جُمّی! گاؤں کے پٹیل ٹھاکر ہری سنگھ نے اس سے کہا: سنا ہے کل

تو شہر جا رہا ہی؟"

"ہاں چاچا ——— !" اس نے بڑے ادب سے کہا۔

"کیوں ——— ؟"

"وہاں کام وام تلاش کروں گا۔ آخر مجھے کچھ تو کرنا چاہیئے!"

"شاباش بیٹے ——— ضرور جاؤ بھگوان تمہارے ارادے پورے کرے"۔

ٹھاکر نے محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا

"مگر وہاں تو ریل میں جانا پڑیگا" پاس بیٹھے ہوئے بوڑھے گنپت نے کہا۔

"اور تو کیا اتنی دور پیدل جائے گا" ٹھاکر نے بڑے بوڑھے واقف کار کی طرح کہا: "دیکھو جمّی اگر شہر میں کسی کے پاس نوکری کے لئے جاؤ تو صاف کپڑے پہن کر جانا"

وہ ٹھاکر کی بات سُن کر ہنس دیا اور بولا "اچھا چاچا ——— مگر فوراً ہی اُس کے دل میں خیال آیا کہ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ شاید وہ شہر جا کر گاؤں والوں پر بڑا احسان کرے گا۔

جدھر وہ جاتا لوگ اُس کی بڑی آؤ بھگت کرتے ——— گھر پر آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ عورت، مرد، بوڑھے، بچے اور پھر ان کی نصیحتیں ——— !

"دیکھو جمّی ——— شہر میں چلن سے رہنا؟"

"جمّی ——— اپنے باپ کے پاس چٹھی ضرور بھیجتے رہنا"

"بھگوان تمھیں اچھی طرح واپس لائے تو پھر تمہارا بیاہ کرینگے"

"بیاہ ——— ! بیاہ کا نام سن کر وہ چونک اُٹھتا ——— بھلا بیاہ کی

بھی ایسی جلدی ہی کیا تھی۔ ہوتا رہے گا ــــ ابھی تو اس کے پاس بیاہ کے لئے روپے بھی نہیں تھے اور وہ روپے کمانے کے لئے ہی شہر جا رہا تھا ــــ کلکتہ جیسے بڑے شہر میں ــــ جہاں لمبی چوڑی سڑکیں ہیں ــــ بڑے بڑے محل ــــ موٹریں ــــ سائیکلیں ــــ ٹرام ــــ بس ــــ اور اُن پہ بیٹھے ہوئے بابو ــــ اس کی نظروں میں ایک اَن دیکھی سڑک کا نقشہ بکھر گیا ــــ جس پر سینکڑوں آدمی چیونٹیوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ موٹریں دوڑ رہی تھیں اور پٹریوں پر ــــ بھلا سا نام ہے اس کا ــــ آنے جانے والے اپنی باتیں کرتے رہے اور وہ چپ چاپ بیٹھا ہوا سوچتا رہا ــــ شام کو جب اُسے فرصت ملی تو وہ ندی کی طرف ٹہلنے چل دیا ــــ اکیلا لاپرواہی سے سیٹی بجاتا ہوا، جیسے اُسے دنیا میں کسی بات کی پرواہ ہی نہیں ہے ــــ مگر اُس کے ذہن میں خیالات کے پرچم لہرا رہے تھے اور اُسے ایسا 92
محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہنسوں کے پرے کے پرے کہیں دور سے اُڑتے ہوئے آتے ہیں اور اُسے اچانک دبوچ لیا ہے۔ آہستہ آہستہ نکلتا ہوا وہ ندی کے قریب پہونچا ہی تھا کہ ایک دم ٹھٹک کر اس نے اپنا منھ پھیر لیا اور اسی طرح جھکے ہوئے آہستہ آہستہ مگر تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا ــــ سامنے ندی میں گاؤں کی کئی لڑکیاں نہا رہی تھیں اور ان سب کے کپڑے اس سے کچھ فاصلے پر ندی کے کنارے لگی ہوئی جھاڑیوں میں رکھے ہوئے تھے ــــ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ جیسے اُس کے تلوؤں کے نیچے آگ بھڑک اُٹھی ہے ــــ اس کا سارا بدن گرم ہو گیا اور جھاڑیوں میں پڑے ہوئے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اس وقت کرشن جیسی کوئی حرکت کرے ــــ مگر وہ بمشکل ضبط کئے کھڑا رہا

کچھ دیر بعد لڑکیاں پانی سے نکلیں اور جھاڑیوں کی آڑ میں کپڑے پہننے لگیں۔ اُن کے آپس کے ہنسی مذاق سے جُمّی کو اپنے دماغ میں گھنٹیاں بجتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

"اری رمیا ——" یہ کیا ہیں؟ ایک نے دوسری سے کہا۔

"اور تیرے —————" رمیا جھینپتے ہوئے بولی۔

"اس کا بیاہ تو جُمّی جیسے چوڑے چکلے سے ہو تو سب ٹھیک ہو جائے"

تیسری چہکی "اور تیرا بیاہ ——!"

رمیا نے چڑانے کے لئے بیچ میں بولتے ہوئے کہا "ہاں کلثوم تو جُمّی سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتی؟"

"وہ تجھے شہر لے جائے گا اور سالی بنا کر رکھیگا"

"چپ رمیا کی بچی ——" کلثوم نے ڈانٹتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ 93

"چُپ ——!"

"چُپ —— !!——"

اور پھر وہ آپس میں ہاتھا پائی کرنے لگیں اور وہ چُپکے سے وہاں سے کھسک آیا اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سامنے گاؤں کی جھونپڑیوں میں کہیں کہیں دیئے جل رہے تھے —— اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جلدی جلدی کھیتوں میں سے ہوتا ہوا وہ گھر پہونچا اور جاتے ہی ایک طرف پڑی ہوئی پیال پر اس نے اپنی چادر بچھائی اور مغموم صورت بنائے ہوئے اس پر لیٹ گیا اور اس نے سوچا۔

"بھلا شہر میں یہ ندی، یہ کھیت اور یہ لہراتی ہوئی پگڈنڈیاں کہاں دیکھنے کے لئے ملیں گی —— سُنا ہے وہاں تو بڑے بڑے دریا ہیں جن میں جہاز چلتے ہیں

میلوں لمبے میدان ہیں۔ جہاں گھوڑے دوڑتے ہیں اور لمبی چوڑی سڑکیں ہیں۔ جن پر آدمی چلتے ہیں اور ــــــ کیا واقعی وہ ایسا ہی طاقتور جوان ہے۔" ــــــ

اس کے خیالات نے یک لخت پلٹا کھایا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ لمبا کر کے اس پر بازو سے کلائی تک ہاتھ پھیر کر اُسے دیکھتے ہوئے خیال کیا "یہ کیسے کھُردرے اور بیڈول سے ہیں اور گاؤں کی لڑکیاں اس کی مثالیں دیتی ہیں۔ شاید ــــــ یا شہر میں غید کپڑے پہننے سے یہ اچھے معلوم ہونے لگیں ــــــ اور جب میں وردی پہن کر یہاں آؤں گا۔ تو گاؤں والے کیسے تعجب سے مجھے دیکھیں گے اور میں بھی یہاں آتے ہی سب سے پہلے کلثوم ــــــ !"

"جمی ــــــ جمی بیٹا ــــــ !" اس کے بوڑھے باپ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُسے پکارا۔ ۹۴

اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا ــــــ وہ اپنے بستر سے اٹھا اور اس نے مری ہوئی آواز میں کہا "جی !"

"کیا تم نے رادھو کو چٹھی لکھ دی تھی ؟" بوڑھے نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بابا !" ــــــ

"اب صبح تڑکے ہی تم ٹھاکر ہری سنگھ کے ساتھ حسن آباد چلے جانا۔ وہ تمھیں کلکتہ جانے والی ریل میں بٹھا دیگا۔"

"اچھا !" اس نے جواب دیا۔

"اور دیکھو اگر وہ تمھیں کچھ دے تو لینا مت" بوڑھے نے نصیحت کی۔ "وہ تمھیں کچھ روپیہ دینا چاہتا ہے۔ ابھی شام کو مجھے ملا تو کہنے لگا "رحیم بھیا ــــــ !"

یہ تین چار سو روپیہ جمی کو دیدینا۔ کلکتہ میں بچہ کے کام آجائیں گے"۔ ـــــ مگر میں نے انکار کر دیا ـــــ اس بیچارے کی ایک تمام فصل زمیندار کے یہاں چلی گئی۔ پھر اب ہم کیوں اسے پریشان کریں؟"

جمی نے ایسی متعجب نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ جیسے اس سے پہلے اُسے اس کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا اور ایک لمبی سانس لیکر اس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔

چند منٹ تک دونوں پر خاموشی چھائی رہی اور دونوں باپ بیٹے ایکدوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے رہے ـــــ اچانک بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"جمی ـــــ تمہاری ماں بچپن ہی میں تمہیں چھوڑ کر مر گئی میں نے پھر 95 دوسری شادی بھی نہیں کی۔ کہ کہیں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو ـــــ اور خود پال پوس کر تمہیں اتنا بڑا کیا ـــــ اب تم پردیس جا رہے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو ـــــ؟

ـــــ بوڑھا اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی ـــــ مگر جیسے جمی نے وہ سب کچھ سمجھ لیا۔ جو کہ اس کا بوڑھا باپ کہنے والا تھا ـــــ اور ان سب کے جواب میں اس نے ایک چیخ ماری اور بے اختیار اپنے باپ سے لپٹ کر رونے لگا ـــــ بڑی دیر تک جھونپڑی کی اُداس فضا میں ان کی ہچکیوں کی آواز گونجتی رہی اور ان کے آنسو میلے اور پسینہ میں چکنے ہوئے شلوکوں کو تر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں کی بھڑاس اچھی طرح نکل گئی آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے اور ہچکیوں کی آواز کم ہوتے ہوئے خفیف سی سسکیاں

ہیں تبدیل ہو گئی۔ تو وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے ــــــ اور ابھی وہ
اپنے آنسو پونچھ ہی رہے تھے کہ ہری سنگھ نے آواز دی۔

"رحیم بھیا، کیا میں آ جاؤں؟"

"ہاں ہاں آؤ۔ یہاں ہے کون؟ جو تم آواز دے رہے ہو۔ ہری سنگھ اندر آ گیا۔
اور دونوں کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "میں نے سوچا کہ چلو دیکھوں۔ صبح چلنے کی
تیاری ہوئی کہ نہیں۔ اس لئے آ گیا۔

"اچھا کیا تم آ گئے۔ تھوڑی دیر بیٹھو باتیں کریں گے اور تیاری کرنے کو رکھا
ہی کیا ہے؟"

"اتنے میں جمّی نے سسکی بھری۔ ہری سنگھ ایکدم چونک پڑا اور اس نے جمّی
کا منہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ 96

"یہ تم دونوں یہاں کیا کر رہے تھے" پھر اس نے رحیم کی طرف دیکھا "یہ تو بڑی خوشی
کی بات ہے کہ بیٹا اس قابل ہوا کہ کمانے جا رہا ہے اور تم رو رو کر رنگ میں بھنگ ڈال
رہے ہو۔

"کیا کروں ہری بھیا! دل بھر آیا اور پھر میرے ساتھ یہ بھی رونے لگا۔"
بوڑھے نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی ہنسی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"پریشان کرتے ہو لڑکے کو" اس نے جمّی کی طرف دیکھا "اب تم سو جاؤ صبح
جلدی اٹھنا ہے" اور ہری سنگھ نے اس کی نہیں نہیں کے باوجود اسے زبردستی لٹا دیا
اور خود رحیم سے باتیں کرنے لگا ــــــ پھر ادھر ادھر کی باتیں ــــــ
جیسی کہ اس کی عادت تھی۔ البتہ جمّی غنودگی کے باعث انھیں اچھی طرح نہیں سن سکا

اور ——— پھر وہ نہ معلوم کب سو گیا اور وہ دونوں بوڑھے بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے ——— مگر جب اُس کی آنکھ کھلی تو ہری سنگھ کی بیل گاڑی کے ہوئے اُس کے دروازے پر کھڑا تھا اور اس کے مکان پر بہت سے لوگ جمع تھے ——— آخر وہ شہر جا رہا تھا ——— جسے دیکھنے کی آرزو کرتے کرتے لوگ بوڑھے ہو چکے تھے اور پھر بھی نہیں دیکھ پائے ——— وہ اٹھا اور جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہو کر جب وہ رخصت ہونے کے ارادہ سے باہر آیا۔ تو رادھو کی ماں گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ایک دم خوش ہو گیا اور سب سے ملنے کے بعد اُس نے بڑھیا کے پاس پہونچکر کہا۔

"کیوں ماں تم کیوں آگئیں، کل تو مل چکی تھیں؟"

97 "میں نے سوچا۔ بڑھیا نے کھانستے ہوئے کہا۔ چلتے چلتے اور بیٹا سے مل لوں میرے لئے تو جیسا رادھو ویسا تو ——— !"

"چھبی تو رادھو کو سنی ہے" لوگوں میں سے کسی نے کہا۔

"نہیں بیٹا ——— !" بڑھیا سانس لینے لگی۔ اور لوگ اُس کی باتوں پر ہنسنے لگے۔

"رادھو سے کہہ دینا" بڑھیا نے پھر کہنا شروع کیا: بہت دن ہو گئے اب دس پانچ دن کے لئے گاؤں ہو آؤ"

"اچھا ماں ——— ! اب ہم دونوں ساتھ ہی آئیں گے" جمی نے کہا۔

"اور یہ بھی کہنا کہ ——— !"

"ہاں ہاں سب کہہ دے گا" ہری سنگھ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"چلو جمی بیٹھو گاڑی میں!"

وہ جلدی سے گاڑی میں سوار ہو گیا اور جب گاڑی آگے بڑھی۔ تو اس کی نظریں بوڑھے باپ کی نظروں سے چار ہوئیں۔ بوڑھا تو اسے جاتے دیکھ کر ہی فوراً جھونپڑی میں چلا گیا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ——— مگر وہ ضبط کئے رہا اور تمام راستہ ہری سنگھ کی ہنسانے والی باتوں پر ہاں ہوں کرتا رہا ——— گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے وہ آج سچ مچ اپنی ماں کی آغوش سے دور ہو رہا ہے۔ جہاں اس نے اپنی عمر کے بیس سال گذارے ——— جھومتے ہوئے درختوں کے سایہ میں لیٹ کر اس نے کہانیاں سنیں جنگلی میووں سے لدے ہوئے باغوں سے پھل کھائے اور چاندی کی طرح بہتی ہوئی ندیوں سے ٹھنڈا، شیریں پانی پیا ——— راتوں کو جب کھیتوں میں کپاس کے پھول کی طرح چاندنی کھلی ہوتی تھی۔ وہ جھونپڑی کے دروازے میں کھڑا ہو کر گھنٹوں موتیوں کے سمندر میں تیرتے ہوئے چاند کو تکا کرتا ——— یہاں تک کہ باپ چڑھ کر اسے بلا لیتا ——— اور مجبوراً اسے جا کر بستر پر سونا پڑتا ——— مگر اب یہ سب باتیں کہاں۔

وہ ان سب سے دور ——— بہت ہی دور جہاں چھٹی ملنا تو آسان ہے مگر انسان کا ملنا ناممکن ———! وہ پہونچ جائے گا ——— اور ———!

"جمی کیا سوچ رہے ہو؟ اترو گاڑی سے اسٹیشن آ گیا اور وہ چونک پڑا۔

اس نے دیکھا کہ گاڑی ایک بڑے سے مکان کے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور ہری سنگھ بیلوں کے پاس کھڑا ہوا انہیں گھاس ڈال رہا ہے۔ وہ با دلِ ناخواستہ گاڑی سے اترا اور پہلے ہری سنگھ اسے ایک دوکان میں لے گیا۔ جہاں ان دونوں

نے ایک ایک گلاس دودھ پیا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ دونوں خلاصے بڑے دروازوں میں سے نکل کر پلیٹ فارم پر آئے۔ ہری سنگھ نے ایک قلی سے پوچھا۔

"یہاں گاڑی کس وقت آتی ہے؟"

قلی نے ٹکٹ بابو کی طرح غور سے سر سے پاؤں تک دونوں کو دیکھ کر پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

"کلکتہ!" ہری سنگھ نے فوراً جواب دیا۔

"ابھی تمہاری گاڑی آنے میں ایک گھنٹہ ہے!"

اور وہ دونوں تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ پھر جُمّی گاڑی میں سے اپنے کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی نکال کر لایا اور وہ دونوں ایک جگہ بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ 99

"ارے رادھو، اُو رادھو، ادھر آؤ، میں یہاں ہوں" جُمّی رادھو کو پلیٹ فارم پر بھاگتے دیکھ کر چلایا۔ رادھو نے پلٹ کر اُسے دیکھا اور دوڑ کر اس کے قریب آیا اور جُمّی سے لپٹ گیا "ارے جُمّی تم آ گئے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ رحیم کاکا تمہیں نہیں آنے دیں گے!"

"آنے کیوں نہیں دیتے؟" جُمّی نے اپنی گٹھڑی سنبھالتے ہوئے کہا۔ گاؤں میں تو آجکل سب کام کاج چوپٹ ہو رہا ہے۔ سال پہ جو کچھ اناج ملتا ہے۔ اس میں بھی داروغہ اور سپاہی حصّہ بٹا لیتے ہیں۔ بس سمجھ لو کہ سال بھر تک بیگار کرنا پڑتی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا تم یہاں آ گئے۔ ایک سے دو بھلے" رادھو نے ایک سلاخوں دار دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ماں تو اچھی ہے"؟

ہاں ٹھیک ہے ـــ چلتے وقت کہا تھا کہ رادھو کی بہت یاد آتی ہے بھیج دینا" وہ دونوں دروازے پر کھڑے ہوئے بابو کو ٹکٹ دے کر باہر آئے اور اسٹیشن کی حد سے نکل کر سڑک پر چلنے لگے۔

جمی کو ایک سامنے ایک بہت بڑی بلڈنگ دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور اس نے رادھو سے کہا "یہاں بہت بڑے بڑے مکانات ہیں!"

"ہاں!" رادھو نے ہنستے ہوئے کہا "تم ابھی چل کر سستا لو۔ ذرا تمہاری نوکری کا ٹھیک ہو جائے تو پھر تمہیں گھماؤں گا" 100

"تم نے کچھ طے کیا؟" جمی نے متفکر ہو کر سوال کیا۔

"ہمارے صاحب کا مالی بھاگ گیا ہے۔ ابھی تو تم وہیں کام کرنا اور مزے سے میرے پاس ہی رہنا۔ پھر دیکھا جائے گا"

وہ یہ سن کر خوش ہو گیا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ رادھو سے لپٹ کر اس کا منہ چوم لے ـــ ابھی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ اچانک سڑک پر ایک گاڑی گھڑگھڑاتی ہوئی اس کے قریب سے گذر گئی ـــ

وہ حیران رہ گیا اور دیر تک غور سے سڑک پر دوڑتی ہوئی دھاریوں کو دیکھتا رہا

"یہ کونسی گاڑی ہے؟" اس نے رادھو سے سوال کیا۔

"یہ ٹرام ہے ـــ بجلی سے چلتی ہے۔ آؤ کبھی اس میں بٹھائیں گھر بھی

جلدی پہنچ جائیں گے۔"

وہ دونوں آگے چوراہے پر جاکر کھڑے ہوگئے ——— اور ابھی انھیں وہاں کھڑے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ٹرام وہاں آکر رُکی اور ان کے ساتھ ایک دم بہت سے آدمی اس پر چڑھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی ٹرام پھر چل پڑی —— اور دوکانیں، بلڈنگیں اور سڑک پر چلنے والے آدمی انھیں بھاگتے ہوئے دکھائی دینے لگے —— ریل کے سفر نے پہلے ہی اس کا دماغ پریشان کر دیا تھا۔ اب ٹرام کی کھڑکھڑاہٹ اور تیز رفتاری سے اُسے چکر سے آنے لگے ——— مگر جلد ہی ٹرام ایک پتلی سی گلی کے پاس پہنچ کر رُک گئی اس کے ٹھہرتے ہی وہ دونوں ٹرام سے کود پڑے۔ گلی میں داخل ہوئے ——— تھوڑی دور چلنے کے بعد
کھلی ہوئی جگہ میں ایک چھوٹی سی بلڈنگ کے احاطہ میں وہ دونوں داخل ہوئے۔ ۱۰۱

"اب تم منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ" رادھو نے ایک خوب صورت سی کوٹھری میں اُسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا "شام کو صاحب آئیں گے تو میں تمہیں ان سے مِلا دوں گا۔ اِتنی دیر تم یہاں آرام کرو اور اب میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں!"

"کہاں؟" جمی نے پوچھا۔

"پہرے پر! ——— سمجھے" اور رادھو جمی کے اس بھولے پن پر ہنس دیا۔

اور اس کے جانے کے بعد جمی سوچنے لگا "یہ رادھو تو بڑا چھپا رستم ہے۔ کلکتہ میں آکر کیسی اچھی کوٹھری میں رہتا ہے ——— ایسا مکان تو گاؤں کے زمیندار کا بھی نہیں ہے۔ یہاں کوٹھری کے سامنے کیسا اچھا باغ لگا ہوا ہے۔ اس سے ہمیشہ

طبیعت تروتازہ رہتی ہوگی۔ جبھی تو اُس کا یہاں جی لگا ہوا ہے اور یہ گاؤں جانے کا نام بھی نہیں لیتا۔ ورنہ اس کھڑپڑ اور چیخ دپکار سے دو دن میں آدمی گھبرا کر بھاگ جائے ——— مگر ہے کیسا شریف کہ مجھے دیکھ کر بچھا جا رہا ہے ——— اور تو اور اُس نے میری نوکری کے لئے بھی خود ہی طے کر لیا ——— یقیناً اس نے صاحب سے میری بہت تعریف کی ہوگی۔ جب ہی تو اُس نے مجھے کام دینے کی حامی بھر لی۔ اب صاحب سے مل لوں تو ایسا جی توڑ کر کام کروں گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے اور رادھو کی بات بھی بنی رہے ——— کہتے ہیں کہ شہر میں جا کر لڑکے بگڑ جاتے ہیں اور گاؤں والوں کو بھول جاتے ہیں مگر ——— رادھو نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور اب میں بھی یہ بتا دوں گا کہ شہر کے لوگ تو بہت 102 نیک اور سمجھدار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ——— !

"چمپّی ——— !چمپّی ——— !!" رادھو نے کمرے میں داخل ہو کر زور سے اُسے آواز دی۔

"وہ ایک دم چارپائی پر سے اُٹھ بیٹھا اور کہا " کیا ہے ؟"

"آؤ صاحب باغ میں ہیں۔ اُن سے تمہارا سلام کرا دوں !"

وہ اس کے ساتھ ہو لیا اور دونوں روشوں پر چلتے ہوئے ایک درخت کے قریب پہنچے۔ جہاں صاحب بنچ پر بیٹھا ہوا اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہا تھا چمپّی کے بدن میں تھرتھری پیدا ہوئی اور سلام کے لئے پیشانی تک اٹھا ہوا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

"سلام، سلام ——— صاحب نے بغیر اس کی حالت پر غور کئے ہوئے

جواب دیا "تم مالی کا کام جانتے ہو؟"

جمی نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا "ہاں سرکار!"

"اچھا اچھا ——" صاحب نے کہا "تم باغ میں کام کرو۔ ہم تمہارا کام دیکھیں گے۔"

"مگر —— حضور ——!" اور جمی کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"ہاں ہاں ہم سمجھ گیا۔ تم کام شروع کر دو" اور یہ کہہ کر وہ پھر اپنے دوست سے باتیں کرنے لگا۔

جمی رادھو کے ساتھ واپس آگیا!

"پھر میں کل سے کام شروع کر دوں؟" اس نے رادھو سے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ میں صبح چل کر تمہیں باغ گھما دوں گا اور تم اندازہ ۱۰۳
لینا کہ کس طرح کام شروع کرنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔"

جمی خوش ہو گیا اور اس نے خیال کیا "رادھو تو شہر میں آ کر بڑا سمجھدار ہو گیا ہے —— اس سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ آپ ہی آپ سب کچھ سوچ لیتا ہے —— اب مہینہ دو مہینہ کام کر لوں تو اس کا بدلا چکا دوں گا —— مجھے کرنا ہی کیا ہے کسی کا احسان رکھ کر۔ بس کھانے کو ملتا ہے اور کچھ باپ کے لئے" —— باپ کا خیال آتے ہی خوشی سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ "وہ کتنا خوش ہوگا۔ جب پہلی بار اسے روپیہ ملیں گے۔ گاؤں والوں کے سامنے وہ اپنا سینہ فخر سے تان لے گا اور جگہ جگہ کہا کرے گا "بھیا —— کیا کرنا ہے اب۔ اب مجھے

کام دام کر کے ـــــ جمی شہر میں صاحب کا مالی ہو گیا ہے نا ـــــ جو کچھ بھی وہ بھیج رہا ہے۔ بس وہی میرے لئے بہت ـــــ اب تو بس وہ یہاں آئے تو جھٹ پٹ اس کا بیاہ ـــــ اور وہ بس بیاہ کا خیال آتے ہی شرما گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ندی والا منظر گھوم گیا ـــــ گاؤں بھر میں کلثوم ہی تو ایک لڑکی ہے اور بابا بھی اُسے ہی پسند کرتے ہیں۔ شاید ـــــ اچانک اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کوئی زور زور سے بڑی جلدی جلدی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا "یہ کون بول رہا ہے؟"

"یہ ریڈیو ہے۔ اس وقت خبریں سنا رہا ہے" رادھو نے کہا۔

وہ دونوں پوری توجہ سے سننے لگے۔ بہت سی باتیں تو جمی کی سمجھ میں ہی نہیں آئیں ـــــ البتہ یہ اس نے بالکل صاف سنا کہ بمبئی میں ہندو مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا ـــــ پندرہ ـــــ اور اس نے دیکھا کہ رادھو یہ خبر سن کر ایکدم چونک پڑا ـــــ جمی یہ دیکھ کر پہلے تو سوچتا رہا۔ پھر ایک دم اس نے رادھو سے کہا ـــــ ۱۰۳

"کیوں رادھو، بمبئی میں ہندو مسلمانوں میں جھگڑا کیوں ہو گیا؟"

رادھو نے مری ہوئی آواز میں کہا "ابھی کچھ دن ہوئے ہندوؤں کو حکومت ملی ہے۔ اب مسلمان اُسے چھیننا چاہتے ہیں"

"کیوں چھیننا چاہتے ہیں؟" اس نے حیران ہو کر کہا "ہمارے گاؤں میں تو گنگدی لال زمیندار ہے۔ اُس سے کوئی مسلمان نہیں لڑتا"

"گاؤں کی بات دوسری ہے" رادھو نے کسی قدر تیز لہجہ میں کہا ـــــ

"تم ابھی ان باتوں کو نہیں جانتے"

وہ چپ ہو گیا مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہندو مسلمان کیوں لڑ پڑے؟ گاؤں میں تو ایسا کبھی نہیں ہوا ——— اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک مرتبہ اس کے باپ کی الٹا کھیری سنگھ سے اُن کی جھڑپ ہو گئی تھی اور دونوں کئی دن تک ایک دوسرے سے نہ بولے تھے مگر گاؤں والوں نے انھیں سخت و سست کہہ کر پھر دونوں کا آپس میں میل کرا دیا تھا ——— پھر یہ کیوں لڑتے ہیں ———؟ شہر میں تو لوگ بڑے سمجھدار ہوتے ہیں ——— رادھو کو ہی دیکھ لو یہاں آ کر تو بالکل ہی بدل گیا ——— اس نے سامنے بیٹھے ہوئے رادھو کی طرف دیکھا جو گال سے ہاتھ لگائے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا اور نہ معلوم کیوں اس وقت اُسے رادھو بڑا خوبصورت معلوم ہوا اور وہ بڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا ——— ۵
دیکھتا رہا اور سوچتا رہا ——— یہاں تک کہ نیند کی دیوی نے اُسے اپنی آغوش میں دبوچ لیا اور وہ زور زور سے خراٹے لینے لگا۔

رات کو تین چار بجے ہوں گے کہ اچانک لوگوں کی چیخ و پکار اور بھاگنے کی آوازیں سن کر وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا ——— اور اس نے اچھی طرح آنکھیں کھول کر دیکھا کہ رادھو کوٹھری کا دروازہ بند کر رہا ہے۔

"کیوں رادھو کیا ہوا؟ یہ شور کیسا ہے؟" جمّو نے گھبراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ———

رادھو نے ایک بڑی سی پتھر کی سل دروازہ میں اڑاتے ہوئے کہا "ہندو

مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا اور شاید مسلمان محلہ کے مکانوں کو لوٹ رہے ہیں؟

"نہیں، نہیں ——— مسلمان ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ شاید ———" اور اس نے فوراً اپنی زبان دانتوں میں داب لی۔

"یہ ہندوؤں کا محلّہ ہے" رادھو نے اپنے بستر کی طرف آتے ہوئے ناگوار لہجہ میں کہا۔ اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہندو ہی اس محلّہ کو لوٹیں۔

جمی چپ ہو گیا اور اس نے سوچا "کیسا بھولا بن رہا ہے جیسے ہندو کچھ کرتے ہی نہیں ہیں ——— دنیا بھر کا چھٹا ہوا بدمعاش کہیں کا ———"

اور اُس کے دل میں رادھو کی طرف سے ایک کھٹک پیدا ہو گئی اور نہ معلوم اندیشہ کی وجہ سے وہ دوبارہ سو بھی نہ سکا اور خیالات کی اسی اُدھیڑ بُن میں صبح ہو گئی۔

١٠٦

"چلو رادھو مجھے باغ دکھا دو! ———"

"اب تم ہی چلے جاؤ" رادھو نے ایسی مدھم آواز میں کہا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ "مجھے ڈیوٹی پہ جانا ہے"

اور یہ کہکر وہ تیزی سے باہر چلا گیا ——— جمی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ کام بھی شروع نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی وہ باغیچہ میں آ کر بلا مقصد اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔

"اچھا اگر اس کا ایسا خیال ہے تو میں بھی اُسے دیکھ لوں گا" اس نے باغیچہ میں ٹہلتے ہوئے سوچا ——— "بڑا ہندوؤں کا طرفدار بنتا ہے اگر بچہ کو چھٹی کا دودھ یاد نہ دلا با تو جمی نام نہیں ——— میرے سامنے ہی مجھے بُرا بھلا کہتا ہے یہ نہیں

سوچا کہ میں مسلمان ہوں سچا اور پکا مسلمان ـــــ اور اُس نے فوراً ہی کلمہ پڑھنا چاہا۔ مگر اُس کے منہ سے ایک بے معنی سی آواز نکلی اور زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔

وہ ٹہلتا ہوا نل کے پاس پہونچ گیا اور بے اختیار اُس کا جی چاہا کہ وہ باہر سڑک پر جا کر تفریح کرے ـــــ مگر رات کی خوفناک کراہیں اور چیخوں کا خیال آتے ہی اس کا دل دہلنے لگا اور دل میں ایسا خوف سمایا کہ وہ فوراً واپس لوٹ آیا۔

وہ کوٹھری میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ رادھو آیا اور جمی اس کے تمتماتے ہوئے چہرہ پر وحشیانہ جوش کو دیکھ کر سہم گیا ـــــ رادھو نے آتے ہی مٹکی سے ایک گلاس پانی پیا اور پھر جمی سے کہا "تم نے کام شروع نہیں کیا؟"

"مجھے پتہ نہیں چلا کہ سامان کہاں رکھا ہے؟" اور ساتھ ہی جمی نے دیکھا۔ کہ رادھو کی صدری کی اندر والی جیب میں چھری رکھی ہوئی ہے۔ 107

"مالی کی کوٹھری بلڈنگ کے اُس طرف ہے" رادھو نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اب تم وہیں جا کے رہو"

وہ سکتہ میں رہ گیا مگر اُس سے اپنی یہ توہین برداشت نہیں ہوئی اور اس نے سختی سے کہا۔

"رادھو ـــــ! صبح سے تم بہک رہے ہو۔ اپنا دماغ ٹھیک کرو"!

"میں جانتا تھا کہ تو ایسی ہی باتیں کریگا" رادھو نے چیخ کر کہا "بدمعاش" اور پھر وہ مغلظ گالیاں بکنے لگا۔

جمی کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور بدن کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے جوش میں آ کر رادھو کا گریبان پکڑا اور قبل اس کے کہ وہ چھُری نکالے جمی

نے اُس کے منھ پر ایک گھونسا رسید کیا اور رادھو کے زمین پر گرتے ہی وہ بھاگتا ہوا کوٹھری سے نکل کر باغیچہ کے دروازہ کی طرف بڑھا دروازہ کے قریب لگے ہوئے درخت کے پاس کھڑے ہو کر اس نے پلٹ کر دیکھا ابھی تک رادھو کا پتہ نہ تھا۔

اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ شہر میں فساد ہو رہا ہے اور وہ ہندوؤں کے محلہ میں ہے! اُس نے سوچا۔ ایسے موقعہ پر کوئی ہتھیار پاس ہونا ضروری ہے۔ —— اور یہ سوچ کر اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس سے کچھ فاصلہ پر ایک زمین کھودنے کا بسیل پڑا ہوا تھا۔ اُس نے دوڑ کر اُسے اٹھا لیا اور جلدی سے دروازہ کی

۱۰۸ طرف چلا ہی تھا کہ اُس کو اپنے قریب ہی کسی چیز کی چمک دکھائی دی اور دوسرے لمحہ میں اُس کو اپنے پہلو میں کوئی چیز گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔ ——

اُس کے منھ سے چیخ نکل گئی —— بسیل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا —— اور وہ لہراتا ہوا پتھریلی زمین پر جا پڑا۔ —— اُس کے گرنے کے بعد رادھو نے غصّہ میں اپنے ہونٹ دانتوں میں چباتے ہوئے اُس کے پہلو سے چھری نکالی اور جُمّی کا گریبان پکڑ کر اُس نے اُسے زمین سے اٹھایا۔

"ایک ہندو کو گھونسہ مار کر تم زندہ جا سکتے ہو ——" اور یہ کہہ کر رادھو نے جُمّی کے گال پر ایک تھپڑ رسید کیا اور اُسے اٹھا کر ایک لکڑی کی شاخ کی طرح باغیچہ کے باہر سڑک پر پھینک دیا —— ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوا تھا۔ کہ اس نے کچھ لوگوں کو اسی طرف آتے ہوئے دیکھا اور وہ اپنی کوٹھری کی طرف

بھاگ گیا۔

"کون ہے؟" آنے والوں میں سے ایک نے اُس کے قریب پہونچکر کہا۔

"کوئی گاؤں کا ہندو معلوم ہوتا ہے" دوسرے نے رائے ظاہر کی۔

"چلو اچھّا ہوا کسی غازی نے ایک کافر کو جہنّم رسید کیا" اور یہ کہتے ہوئے وہ لوگ آگے بڑھ گئے ——— سنسان سڑک کی اُداسی اور بڑھ گئی ———

خاموش فضا میں ہوا کی سسکیاں گونجنے لگیں ——— اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے ہندوستان کے اس حسین و بارونق شہر کلکتہ میں اُلّو بول رہے ہیں۔

اپنے بچّوں سے کہئے!

کہ وہ کہانیوں کی کتابیں اس پتے سے منگائیں۔

رخشندہ مسلمان بہار!

بیداری

۱۱۰ وہ شور و غل، وہ بھیانک صدائیں، چیخ پکار!
چلی تھی کیسی یہ خوں ریزیوں کی بادِ سموم!
سڑک پہ دست و گریباں تھے ظالم و مظلوم!
لہو میں تیرتے تھے فسادیوں کے ہجوم!
عجیب شان سے ہندوستاں ہوا بیدار!
وہ لوٹ مار، وہ غارت گری علی الاعلان!
وہ پیٹرول وہ ماچس، کہ جن کی تھی زرمکان!
مرے خدا! مرے اللہ! اے مرے بھگوان!
عجیب شان سے ہندوستان ہوا بیدار!

کہیں پہ زخمی تھی عورت کہیں تھی مرد کی لاش!
کہیں زنانے گھروں میں گھسے تھے کچھ اوباش!
شریف زادیوں کی عصمتیں تھیں اور عیاش!

عجیب شان سے ہندوستاں ہوا بیدار!

دکانیں بند تھیں لٹنے کے خوف سے ساری!
دکانداروں پہ غنڈوں کا خوف تھا طاری!
گھروں میں بیٹھے تھے سہمے ہوئے یہ ہشیاری!

عجیب شاں سے ہندوستاں ہوا بیدار!

تمام شہر میں ہل چل تھی کاروبار تھے بند!
خریدنے کو پریشان تھے ضرورت مند! 111
تھے کامیاب ارادوں میں اپنے ظلم پسند!

عجیب شان سے ہندستاں ہوا بیدار!

ہزاروں بچے ہوئے قتل کیا ہے کم بیداد!
ہزاروں عورتیں بیوہ ہوئیں بنام فساد!
فضا میں گونج رہی ہے صدائے صد فریاد!

عجیب شان سے ہندوستاں ہوا بیدار
وہ شور و غل، وہ بھیانک صدائیں، چیخ و پکار

قمر جلالی!

اجنبی قدموں کے نشان

112 کسی عمیق سمندر کی بپھری ہوئی لہروں کے مانند اس کے احساسات بل کھا رہے ہیں۔ اُس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات کا سُرخ مادہ کھول رہا ہے وہ سامنے دریچے کے پاس ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھی سنسان سڑک کی طرف دیکھ رہی ہے ٹکٹکی باندھے، جیسے اُس کے تصوّر کے آئینہ خانہ میں ماضی، حال اور مستقبل کے حالات خوفناک سایوں کی طرح لہرا رہے ہوں۔ اُس کی بڑی بڑی دنبالہ دار آنکھوں میں نہ چمک ہے نہ زندگی ـــــ البتہ حرارت ضرور ہے۔ اُس کے گال گرم ہیں ـــ ہونٹ گرم ہیں ـــ جسم گرم ہے ـــ لیکن پیٹ کی بھٹی سرد پڑی ہوئی ہے ـــ روح پر رنج آلود تاریکیاں اس طرح منڈلا رہی ہیں جیسے اوپر چھت میں لگے ہوئے چالیس کینڈل پاور کے دودھیا بلب کے اِردگرد پروانے گھوم رہے ہیں ـــ لیکن بلب کے لئے تو کرنٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ زندہ رکھنے والی

روشنی سے محروم ہے۔ آج چار روز سے اس کے حلق میں چند پیالی چائے، دو تین
بسکٹوں کے سوا کچھ نہیں گیا ـــــ وہ بھوکی ہے اور پوری سچائی کے ساتھ
ـــــ وہ خوبصورت بھی ـــــ اُس کو اپنی دلکشی تسلیم ـــــ اور
یہی برحق کہ ہر ایک چیز کی اپنی ایک قیمت ہوتی ہے لیکن جب خریدار ہی
نہ ہو تو ـــــ؟ خواہ چکلے میں سہی یا گھر کی چار دیواری میں ـــــ
بہرحال ہو گا یہی ـــــ یونہی بھوکوں مرے گی سسک سسک کر ـــــ!

ـــــ پاس والے بالاخانہ میں بھی ایک دوسری عورت اسی طرح بیٹھی ہے ـــــ
خاموش ـــــ ساکن ـــــ جامد ـــــ وہ بھی کچھ سوچ رہی ہے ـــــ مگر اس
کے احساسات کسی عمیق سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کی طرح لہریں نہیں مار
رہے ـــــ اُس کے دماغ میں طرح طرح کے بُرے خیالات کا سُرخ سُرخ ۱۱۳
مادہ نہیں کھول رہا ـــــ وہ ابھی نئی نئی اس چکلے میں آئی ہے ـــــ اس کا
بازار گراں ہے ـــــ اُس کی قیمت مہنگی ہے ـــــ اور اس مہنگائی کی وجہ سے
اُس کے بشرے پر فکر و ادبار کے آثار کا زیادہ غلبہ نہیں ـــــ کوئی ۲۶، ۲۷
کا سِن اور اُجلا رنگ ـــــ تیکھے خدوخال ہونے کے باوجود اُس کے
گال پچک گئے ہیں ـــــ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں ـــــ ہونٹوں میں
نہ رس ہے نہ دلکشی ـــــ لیکن وہ گال رنگ کر ـــــ ہونٹوں پر سُرخی کی تہہ
جما کر اس لگن سے بیٹھی ہے ـــــ کوئی آئے ـــــ کوئی آئے ـــــ پھر بھی کوئی نہ
آئے تو اُس کو اب زیادہ ملال نہیں ہو گا۔ کیونکہ نو وارد ہونے کی حیثیت سے
وہ کافی کما چکی ہے مگر ـــــ!

اُس کے گرم گرم نیلے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں ـــ وہ کچھ بڑبڑا رہی ہے ـــ کسی طرح جئے ـــ کیا کرے ـــ کہاں جائے ـــ پاس پیسہ نہیں ـــ خریدار عنقا ہیں ـــ عنقا ہی نہیں ـــ بلکہ ناپید ہیں ـــ سب ہندو ہیں ـــ مسلمان ہیں ـــ کوئی انسان نہیں ـــ کسی کے پہلو میں دل نہیں ـــ دلوں میں جذبات نہیں ـــ صرف مذہب ہی ـــ گائے ہے ـــ باجہ ہی ـــ پاکستان ہے ـــ اکھنڈ ہندوستان ہے ـــ جے ہند کے نعرے ہیں ـــ اللہ اکبر کی تکبیریں ہیں ـــ کوئی نہیں جانتا محض سیاسی آزادی اور نظریاتی اختلاف کی بنا پر ـــ اپنی معاشرت ـــ اپنا تمدن ـــ اپنا کلچر اور آفاقی اتحاد کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا کتنا بڑا جرم ہے ـــ کس قدر سنگین کہ اس کا تصوّر بھی ممکن نہیں ـــ اس طرح یہ لوگ پیچھے اور ابدی انقلاب کی راہوں میں خندقیں کھود رہے ہیں ـــ اور اپنی وہ طاقت جو انھوں نے بیرونی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے بدقّت تمام سال ہا سال کی جاں سوز جدّوجہد کے بعد فراہم کی تھی. آج خود اپنے خلاف استعمال کر رہے ہیں ـــ اور نہیں جانتے کیوں ـــ ؟ اور جو لوگ جانتے ہیں ـــ وہ اپنے ذاتی مفاد پر ان صداقتوں کو قربان کر رہے ہیں ـــ یقیناً انسانیت کا خون ان کے مقصد کے لئے نیک فال ہی! ـــ

اُف اللہ ـــ یہ بھوک ـــ وہ اوڑھنی کو اپنی کمر سے کستے ہوئے بڑبڑاتی ہے ـــ کبھی یہ فساد ختم بھی ہو گا ـــ !؟

اُوں ـــ کیا ہوا اچھی ـــ پاس والے بالاخانہ کی عورت چونکتی ہے ـــ نیچے سے پولیس کی لاری سنسناتی ہوئی گذر جاتی ہی! ـــ

"کچھ نہیں ... میں سوچ رہی تھی، کبھی یہ فساد ختم بھی ہوگا یا نہیں؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــ جانے کیا ہوگا ہمارا ـــ ؟"

"ہوگا کیا ـــ زیادہ سے زیادہ یہی کہ بھوکوں مریں گے ـــ مگر کسی کو کیا ـــ اور ابھی تو صرف ایک ہفتہ ہوا ہے ـــ پھر ایک مہینہ ہوگا ـــ پھر ایک سال ـــ لوگ یونہی لڑتے رہیں گے ـــ اس طرح آپس میں ـــ جیسے دشمن دشمن سے ـــ حتیٰ کہ ہمارے پاس کوئی نہیں آئے گا ـــ کوئی بھی نہیں ـــ سب ہندو ہوں گے سب مسلمان ـــ!؟"

"کیسی سنسان پڑی ہے یہ سڑک ـــ!؟"

"ہاں کبھی رات کی تاریکیوں میں یہاں میلہ لگتا تھا؟

جب لوگوں کے دلوں میں نور تھا روشنی تھی ـــ لیکن اب اُن کے دل 115
قبروں کی طرح تاریک ہیں ـــ اُن کو روشنی کی ضرورت ہے ـــ وہ اندھیروں سے ڈرتے ہیں ـــ اب کیوں آنے لگے یہاں ـــ کیوں لگنے لگا میلہ ـــ! اب یہاں میلہ نہیں لگے گا ـــ یونہی سنسان پڑی رہے گی سڑک ـــ سدا ویران ـــ اُجاڑ ـــ اور مایوس ـــ!

ہاں اب ہم کو ـــ ہمارے من کو ـــ ہمارے جسم کو خریدنے والے بٹ چکے ہیں ـــ جے ہند اور اللہ اکبر کے نعروں میں ـــ اب انتظار فضول ہے ـــ چلو چل کر سوئیں ـــ آرام کریں ـــ بجھا دو بلب ـــ پونچھ ڈالو رنگ ـــ بند کر دو دروازے ـــ کیا سوچ رہی ہو میرا ـــ تمہارا بھگوان بھی ایسے وقتوں میں آرام کی نیند سوتا ہے ـــ تم بھی سو جاؤ ـــ جاؤ!"

ابھی سے —— ابھی تو دو بھی نہیں بجے خبریں تو سُن لو —— میرا اپنے ریڈیو اسٹیشن کا پروپیگنڈہ کرتے وقت ایک طرح کی طمانیت محسوس کرتی ہے۔

کیسی خبریں —— کس کی خبریں —— یہی نا کہ بھائی کو بھائی نے مار ڈالا —— باپ نے بیٹے کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا —— چوٹی والوں نے داڑھی والوں کے گھروں میں آگ لگا دی —— بڑے فرقے نے چھوٹے فرقے کو نیست نابود کر دیا —— ایک مجمع نے دوسرے مجمع پر پتھر پھینکے —— پولیس نے لاٹھی چارج کیا —— گولی چلائی —— اشک آور گیسوں کا استعمال ہوا —— اتحادی قوموں کی کونسل میں وجے لکشمی نے دھواں دھار تقریر کی۔ کرشنا مینن پنڈت جواہر لال نہرو کے ذاتی سفیر ہیں، اور ایچ۔ ایم اصفہانی مسٹر جناح کے ذاتی نمائندے ——

نہیں، نہیں، نہیں، میں نہیں سنوں گی ایسی خبریں —— اور پھر ہمیں کیا —— ہمیں تو اپنے خاوند چاہئیں —— ایک رات کے دس —— دس نہیں تو پانچ —— پانچ نہیں تو تین —— پھر یہ خبریں اچھی بھی لگیں گی اور اُستاد فیاض حسین خاں کا مالکوس بھی مزہ دے گا —— پرسوں ایک آیا تھا مرا اُتجا —— اُسے زندگی سے شدید محبت تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ میں جینا چاہتا ہوں اور لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں —— میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان —— میں کچھ بھی نہیں۔ صرف انسان ہوں —— میرا نام کلیم ہے —— کلیم! جس کا کلام کوئی نہیں سنتا —— سب اس کو مارنے پر آمادہ ہیں —— اس کے پاس صرف ایک ویشیا —— اس کے معاوضہ میں وہ یہاں پناہ چاہتا تھا —— میں نے اس کو بھگا دیا اور کیا کرتی ——

ہاں اس طرح ہر ایک کو پناہ دینے لگوں تو ہو چکا —— کام کرو —— مزدوری دو

اور رستہ پکڑو ــــ وہ پیچھے پاؤں لوٹ گیا بعد میں مجھے رنج ہوا، کم از کم اس سے وہ روپیہ تو لے لیتی ــ کیونکہ اُس کے نیچے اُترتے ہی میں نے دیکھا ــ گلی کے نکڑ سے ایک آدمی برآمد ہوا اور پیچھے سے اُس کے پیٹ میں چھرا گھونپ کو بھاگ گیا ــــ تھوڑی دیر بعد پولیس کی لاری کے ساتھ ایمبولینس کار آئی اور اُسے اٹھا کر لے گئی۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا ــ کیوں مارا ــ کس نے مارا ــ آخر اُس کا قصور کیا تھا ــ یہی نا کہ اس کے ماں باپ نے اپنے شجرہ نسب کی تکمیل کے لئے اُس کا نام کلیم رکھا تھا اور وہ کلیم یوں مارا گیا ــ صرف نام کی وجہ سے ــ جس کا کلام کسی نے نہیں سُنا ــ اس لئے کہ وہ صرف انسان تھا بیچارہ ــــ !

جانے اُس نے کچھ کھایا بھی تھا یا نہیں !

وہ سوچتے سوچتے تھک جاتی ہے ــ اُس کے ہاتھ پیر ٹوٹنے لگتے ہیں ۱۱۷
ــــ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو جاتے ہیں ــ وہ سامنے سنسان سڑک کی طرف بغور دیکھتی ہے ــــ یہی وہ سڑک ہے جس پر چار سال پہلے انہی لوگوں نے جمع ہو کر ڈاکخانہ کی سیمنٹ اور ریت کی بنی ہوئی عمارت میں آگ لگائی تھی ــ بجلی کے تار کاٹے تھے ــ موٹے موٹے تنوں کے درخت کاٹ کر پوری سڑک پر بچھا دیتے تھے ــ یہیں پر لوگوں نے با آوازِ بلند کہا تھا۔ ــــ نکل جاؤ ــــ ہندوستان چھوڑ دو! ــــ اسی سڑک پر پولیس نے رُلانے والی گیس استعمال کی تھی ــ مجمع پر گولی چلائی تھی ــ دستی بم پھینکے تھے ــ یہیں پر دستی بم پھینکنے والوں کی لاری میں آگ لگائی تھی ــــ سفید چمڑی والے فوجیوں کے چہروں کو اسی سڑک پر جھلسا گیا تھا ــ یہیں

اسی سڑک پر مختلف فرقوں —— مختلف نظریوں —— مختلف عقائد کے لوگ تھے —— ایک خیال —— ایک آواز —— ایک مقصد ——!

اُس کا ذہن گزران کے لئے اُٹھتا ہے —— پھر دھیرے دھیرے اپنے گداز بازوؤں کو سہلاتا ہوا سینہ پر آکر ٹک جاتا ہے —— وہ اپنا اُبھرا ہوا گداز سینہ ٹٹولتی ہے —— ابھی تو وہ کافی جوان ہے تیس بتیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہے —— ویسے بھی اُس کی ہڈی طاقتور ہے —— وہ تندرست ہے توانا ہے —— وہ سدا جوان رہے گی اور رہنا بھی چاہئے —— وہ احتیاط بھی تو کتنا کرتی ہے —— کسی کو اپنا سینہ چھونے نہیں دیتی —— ہونٹ چومنے سے اُسے شدید نفرت ہے اگر ہونٹوں کا رس ضائع ہو گیا تو —— یہ سینے کے کبوتر اُڑ گئے تو —— یہ اور آنکھوں کی چمک فنا ہو گئی تو —— ؟؟؟ اس لئے وہ ابھی جوانی، صحت اور خوب صورتی کو برقرار رکھنے کے بارے میں کافی محتاط اور سلیقہ مند ہے —— گو اس چکلہ میں پرانی ہونے کی وجہ سے اس کا بازار مندا پڑ گیا ہے پھر بھی وہ ہزاروں میں ایک ہے —— جنگ کے دوران میں اُس کی اِس قدر مانگ تھی کہ بات کرنے کی فرصت ملنا دشوار تھا —— اور خود بھی وہ انگریزوں کی بیوی بنتے ہوئے ایک عجیب طرح کی طمانیت محسوس کرتی تھی —— مگر اب جب کہ ملک پہ قومی حکومت کا جھنڈا لہرا رہا ہے تو کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں —— طمانیتِ قلب تو کجا آج چار وقت سے اُسے روٹی بھی نصیب نہیں —— حالانکہ پہلے کے مقابلہ میں اس نے اپنی قیمت گھٹا دی ہے —— دنیا کی دوسری اشیاء کی قیمت بڑھ رہی ہے قیمت گھٹانے کے ساتھ وہ اپنی بھوک نہیں گھٹا سکی۔ بھوک گھٹانا کوئی آسان کام نہیں!!!

"اُداس ہو ___ میرا پوچھتی ہے!"

"نہیں تو!"

"تو پھر!"

"سوچ رہی ہوں" وہ اپنی اُداسی چھپانے کی کوشش کرتی ہے!

"کیا ___" "مجھے معلوم ہے تم اُداس ہو ___ بھوکی ہو ___ تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا ___ تم چھپاتی ہو، مگر سچی بات کو چھپانا بُری بات ہے ___"

"ہوگا ___" مگر وہ کس طرح کہدے ___ ہاں وہ بھوکی ہے ___ آج چار روز سے وہ اُس کی چائے اور بسکٹ کے چند ٹکڑوں کے سہارے جی رہی ہے ___ پایا نی پی پی کر وہ پیٹ کی آگ بُجھا رہی ہے ___ مگر اب ___

اب نہیں ___ نہیں ___ وہ نہیں کہہ سکتی ___ کِس منہ سے کہے ___ معاوضہ میں 119

وہ میرا کو ایک چائے کی پیالی بھی نہیں پلا سکی اور پلاتی کہاں سے ___ کماتی ہو تو پلائے ___ نیچے تو کرفیو آرڈر نافذ ہے ___ واہ اچھا انصاف ہی ___ لڑے تو کوئی اور بھوکوں مرے وہ ___! پھر بھی وہ اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی ___ خودداری بھی کوئی چیز ہے ___ ابھی تو اُس کی خودداری زندہ ہے ___ اور جب تک کہ اُمیدوں کے سورج کی ایک کرن بھی باقی ہے ___ اُس کی خودداری زندہ رہے گی ___ لازمی، قطعی کوئی طاقت اُسے فنا نہیں کر سکتی ___ مگر اب امید کی آخری کرن بھی بجھتی جا رہی ہے ___ پرواہ نہیں ___ کوئی پرواہ نہیں ___ اُس کو آس رکھنا چاہیئے ___ ابھی ایسا بگاڑا ہی کیا ہے ___ زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ یا نو ___ ابھی کافی رات باقی ہے ___ کوئی نہ کوئی آئے گا ضرور آئیگا

یہ نہیں ہو سکتا ــــ وہ بھوکوں نہیں مر سکتی ــــ ابھی تو کافی دلکش ہے ــــ خوب صورت ہے ــــ جوان ہے ــــ!

سڑک بیوہ کی زندگی کی طرح سنسان پڑی ہے ــــ اِکّا دُکّا راہگیر چوروں کی طرح اس گلی سے نکل کر اُس گلی میں گھس جاتے ہیں ــــ چلتے چلتے کوئی کسی کا سر پھوڑ دیتا ہے ــــ کسی پر تیزاب ڈال دیتا ہے اور کوئی کسی کی کمر میں چھرا گھونپ کر فرار ہو جاتا ہے ــــ صبح سے کیا پورے ایک ہفتہ سے وہ یہی دیکھ رہی ہے!

کسی نہ کسی کی آمد کا غیر یقینی انتظار کرتے کرتے وہ تھک چکی ہے ــــ اب اُس میں زیادہ برداشت کرنے کی ہمت نہیں ــــ اُس کے دل کی گہرائیوں سے
120 نفرت کا طوفان ابھر کر اُس کے ذہن کی وسعتوں میں پھیل جاتا ہے ــــ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے زور زور سے پاؤں ہلانا شروع کر دیتی ہے لیکن پاؤں ہلانے سے کچھ نہیں ہوتا ــــ اُس کا ذہنی خلفشار برابر بڑھتا جا رہا ہے ــــ لمحہ بہ لمحہ ــــ لحظہ بہ لحظہ ــــ وہ اپنی کمر کے گرد کسی ہوئی اوڑھنی کو اور کس لیتی ہے مگر ــــ

اُف اللہ کیا کرے ــــ کوئی نہیں آتا ــــ ہولے ہولے ماحول سے بیزاری کیساتھ اُس کے ذہن کی گہرائیوں میں خود اپنی ذات سے نفرت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے ــــ وہ اپنی خوب صورتی کو نوچ کر پھینک دینا چاہتی ہے وہ اپنے پھڑکتے ہوئے کبوتروں کو اُڑا دینا چاہتی ہے ــــ وہ اپنی دُنبالہ دار آنکھوں کی شیلانی چمک کو تاریکیوں میں کھول دینا چاہتی ہے ــــ وہ چاہتی ہے دُنیا کے ایسے تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون سے اپنے پیٹ کی آگ بجھائے جو اللہ اکبر،

اور یہ ہند کے کھوکھلے نعروں کے ذریعہ انسانیت، اخلاق، رواداری، تمدن، معاشرت
اور آپس کے بھائی چارے کو فنا کر دینا چاہتے ہیں جن کے پھیلائے ہوئے زہریلے جراثیم
فرقہ وارانہ منافرت کا متعدی مرض بن کر اس کے خریداروں کو بے موت مار رہے
ہیں!

نہیں، نہیں، کوئی نہیں مر رہا — کوئی کسی کا دشمن نہیں — کوئی کسی سے
نفرت نہیں کر رہا — سب بھوکے ہیں اور بھوک ہمیشہ زندگی کی توہین کرتی ہے
انسانیت — اخلاق — اتحاد — محبت — جذبات — نظریئے — اور تصورات
سب کی توہین — اس بھوک کے ادنیٰ سے اشارے پر بڑے بڑے مضبوط نظام
درہم برہم ہو جاتے ہیں — آج سارا ہندوستان بھوکا ہے — راس کماری سے
لے کر ہمالیہ پربت کی چوٹی تک کوئی بھی ایسا نہیں — جس کے پیٹ میں بھوک کی
آگ نہ سلگ رہی ہو — اور آخر کب تک —؟ سلگتے سلگتے ایک نہ ایک
دن اس آگ کو بھڑکنا ہی پڑتا ہے — صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے —
روحانی بھوک — جسمانی بھوک — پیٹ کی بھوک — الغرض ہر بھوک دنیا
کو اپنے گرد اس قدر سمیٹ لیتی ہے کہ پتلی کی بے نام سی گردش میں بھی کائنات محصور
ہو کر رہ جاتی ہے — پھر اس سے آگ اٹھتی ہے — شعلے بلند ہوتے ہیں —
خون کی ندیاں بہہ نکلتی ہیں — حق و باطل میں جنگ ہوتی ہے — اندھیرے
بھاگ جاتے ہیں — روشنیاں نمودار ہوتی ہیں — پھر آہستہ آہستہ اندھیرا دبے
پاؤں داخل ہوتا ہے اور اپنی بساط پھیلاتے ہیں وہ تمام کی تمام ناکام اور پسپا شدہ
ظلمتیں اس سے تعاون کرتی ہے جنھیں کمزور روشنیوں نے مجبوراً اپنے یہاں

پناہ نہیں رہتی ہے ——— پھر وہی ہوتا ہے جو اب ہو رہا ہے ——— یہی قتل
و خونریزی ——— غارت گری و فسادات ———!

وہ کرسی سے اُٹھ کر اندر چلی جاتی ہے۔ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اُسے
شک ہوتا ہے ——— اس کی جوانی ڈھل رہی ہے ——— اس کے چہرے پر جھرّیاں
نمودار ہو رہی ہیں ——— اس کی آنکھوں کی چمک فنا ہو رہی ہے ——— سچ تو ہے آخر کب
تک ——— جب روٹی ہے تو سب کچھ ہے ——— جوانی ——— شباب ——— خوب صورتی
——— نیکی ——— گداز بازو ——— اُبھرا ہوا سینہ ——— پھڑکتے ہوئے کبوتر ——— بانکی چتونیں
——— کمان کی طرح ابرو ——— سرخ سفید رنگت اور نرم نرم لچک دار بدن ———
مگر بھوک کے آگے سب بے کار ——— فضول ——— ہیچ اور ناکارہ ——— کچھ نہیں ——— کاش وہ
میرا اسے سچ سچ کہہ دیتی ——— وہ اقرار کرلیتی کہ ہاں واقعی وہ بھوکی ہے ——— ۱۲۲
وہ ایسی نہیں جو ایسے عالم میں اُس کی مدد نہ کرتی ——— لیکن موئی یہ خودداری ——— آج
چار روز سے بھوکا مار رہی ہے ——— اب کس طرح کہے ——— کس منہ سے کہے ——— خیرات
نہ سہی اُدھار سہی ——— مگر کس طرح مانگے ——— یقیناً وہ اُس کو کچھ نہ کچھ دے سکتی
ہے ——— وہ ابھی نئی نئی آئی ہے ——— اس کا بازار رہے گا ——— اس کی قیمت گراں ہے
——— اُس کے پاس آجکل بہت کچھ ہے ——— وہ دے سکتی ہے ضرور دے سکتی ہے
——— مگر کیا کرے ——— اب دستِ سوال دراز کرنا اس کے بس سے باہر ہے
——— وہ مر جائے گی یونہی سسک سسک کر، مگر ——— اُس کی آنکھوں میں
اندھیارے لہریں مار رہے ہیں ——— اس کے دل کی دھڑکن ڈوب رہی ہے ———
اُس کے منہ سے رال بہہ رہی ہے ——— آگ ——— خون ——— قتل ——— غارت گری اور

خونی ہے ہندوستان

شور و شغف کی تاریک وسعتوں میں ــــ صرف ایک چائے کی پیالی ــ ایک بسکٹ، یا ایک روٹی ـــ بس وہ زندہ رہ سکتی ہے آج تو ـــ کل کا اللہ مالک ہے! ـــ ـــ

ـــ ہونہہ ـــ اللہ! کس کا اللہ ـــ؟ وہ جھلا کر ادھر اُدھر دیکھتی ہے ـــ کہاں ہے اللہ ـــ! اگر واقعی اللہ ہوتا تو وہ بھوکوں کیوں مرتی ـــ؟ وہ تو پتھر کے اندر بھی کیڑے کو رزق پہونچاتا ہے مگر اس کے پاس کیوں نہیں پہونچا رہا ـــ ـــ اور اس کے سینکڑوں بندے آپس میں کیوں کٹے مر رہے ہیں ـــ اللہ تو یہیں کہیں کسی موٹے پیٹ والے کی تجوری میں بند ہوگا ـــ یا کسی لانبی داڑھی والے مولوی، اور اونچے تلک والے پنڈت کے پہرے میں بیٹھا چائے پی رہا ہوگا ـــ یا شاید حقہ گڑگڑا رہا ہو ـــ بہرحال اس وقت وہ یہاں نہیں اور پھر اس کا بھروسہ ہی کیا کیا جائے کب سو جائے ـــ نہیں نہیں اللہ کے آسرے پر نہیں بیٹھ سکتی۔ ۱۲۴ کسی کو آنا چاہئے ـ کوئی بھی آئے ـ لچا لفنگا ـ بدمعاش ـ آوارہ ـ غنڈہ، کوئی شریف ـ عزت دار ـ خواہ کسی کے ہاتھ میں چاقو ہو یا خون آلود چھرا ـ جو اوپر آنے سے پہلے کسی کے پیٹ میں گھونپ کر آیا ہو ـــ اور نیچے اُتر کر کسی کے پیٹ میں گھونپ دے ـــ بہرحال کوئی آئے ـ خواہ اس سے اوپر آتے ہی سب سے پہلے دام چکانے نہ سہی ـــ اُس کو منھ مانگے نہ دے نہ سہی ـ وہ جو کچھ بھی دیگا آج وہ لے لے گی بلا حیل و حجت ـ خوشی سے ـــ اور آج تو وہ بے زبان بیوی کی طرح اس کو اپنے ان چھوئے ہونٹ کو بھی چوسنے دے گی اور سینہ بھی ـــ اور وہ اں آنکھوں میں شرم و حیا کی کیفیت اور کنواریوں جیسی معصومیت پیدا کر کے وہ اس کی طرف چوری چوری دیکھے گی ـــ اس کے دل کو لبھائے گی ـــ رجھائے گی!

مسکرائے گی ــــ بے روپ نہیں بلکہ سچی مسکراہٹ جو اُس نے آج سے بارہ سال پہلے اپنے شوہر کو پیش کی تھی ــــ معنی خیز اور آبدی مسکراہٹ ــــ کاش وہ اُسی طرح مسکراتی رہتی ــــ اُسی طرح ساری کائنات اس کی مسکراہٹ میں ڈوبی رہتی۔

جن دنوں وہ اپنے گاؤں کے زنانہ اسکول کی تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ تب اُس کی مسکراہٹ میں رس تھا نہ کیف ــــ بس خالی خولی مسکراہٹ تھی عام مسکراہٹوں کی طرح ــــ لیکن شادی ہونے کے بعد ایک روز جب کہ وہ آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی کہ پیچھے آکر اُس کے شوہر نے آنکھیں بند کر لیں جانے پہچانے ہاتھوں کو چھو کر اس نے کہا تھا ــــ آپ ہیں ــــ اور آپ ہی آپ شرما کر مسکرا دی اور جب اُسے آئینہ میں اپنی مسکراہٹ کا عکس دکھائی دیا تو خود ہی اپنی

مسکراہٹ سے مسحور ہو کر رہ گئی۔ ۱۲۴

کیسی دل کش تھی اُس کی مسکراہٹ ــــ کاش اُس کی مسکراہٹ میں وہی دل کشی قائم رہتی ــــ مگر کیوں ــــ ؟ گو اس کا شوہر ایک معمولی مزدور تھا۔ البتہ عام مزدوروں کی طرح جاہل نہیں تھا ــــ بقول اس کے اس نے پرائمری اسکول میں چھٹے درجہ تک تعلیم پائی تھی اور ــــ شادی سے پہلے اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا ہونے والا شوہر مزدور ہے ــــ کپڑے کے کارخانے کا معمولی مزدور ــــ تو مارے دُکھ کے اُس کے آنسو نکل پڑے تھے ــــ لیکن جب وہ بیاہ دی گئی تو ایک معمولی سے مزدور میں مہذب انسان چھپا ہوا دیکھ کر وہ مسکرا دی ــــ وہی دلکش اور موہنی مسکراہٹ ــــ اُس کا شوہر انقلابی خیالات کا مزدور تھا اور اپنے کارخانہ کی مزدور سبھا کا سکریٹری ــــ وہ ایک عالمگیر اتحاد ــــ ایک تمدّن ــــ ایک معاشرت ــــ

ایک نظام اور آفاقی برابری کے لئے اپنی جان تک دینے کو آمادہ تھا اور ہوا بھی یہی ---
- جانے کس بات پہ شہر کے تمام کارخانوں کے مزدوروں نے عام ہڑتال کی -----
شہر کے مختلف حصّوں سے جلوس نکالا --- "انقلاب زندہ باد اور سرمایہ داری برباد"
کے نعرے لگائے --- مالکانِ مل کی جگمگاتی کوٹھیوں کے سامنے مظاہرے کئے ---
ملوں کے دروازوں پر پکٹینگ کی --- بالآخر پولیس کو دخل اندازی کرنا پڑی -----
مگر اس طرح مزدوروں کا جوش اور بڑھ گیا --- وہ اپنے مطالبات منوانے کے
لئے اپنی جگہ پر جوں کے توں جمے رہے --- اور پتھر کی مضبوط چٹان کی طرح ٹس سے
مس نہیں ہوئے --- غدّاروں نے بہت چاہا اور جب بھی مزدور کام پہ نہ آئے
تو حکومت نے ان پر پابندی عائد کر دی --- پانچ سے زیادہ آدمیوں کا ایک جگہ
جمع ہونا جرم قرار دے دیا --- جلسے جلوس کو ممنوع قرار دیدیا گیا ----- ۱۲۵
مگر روکنے سے کہیں رُکتے ہیں بیخوف قدم ----- اُس کے شوہر نے سب سے
پہلے ایک بھاری مجمع کے ساتھ حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کی کھلم کھلا خلاف
ورزی کی --- پولیس کے منع کرنے --- لاٹھی چارج کرنے اور اشک آور گیس استعمال
کرنے کے باوجود بھی مزدوروں کا اجتماع منتشر نہ ہوا تو اُس نے گولی چلادی ---
سب سے پہلی گولی اُس کے شوہر نے اپنے سینہ پر جھیلی اور وہیں لڑکھڑا کر دم توڑ دیا
----- اس طرح اُس کے گاڑھے لہو نے لال جھنڈے کا رنگ اور گہرا کر دیا۔
- انقلاب زندہ باد ----- ! ساری دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ کا نعرہ بلند کرنے
والا موت کے آغوش میں جا سویا اور وہ رہ گئی تن تنہا --- اِس جھوٹے جگ میں
--- اِس بے ثبات دنیا میں --- صرف ایک گولی --- معمولی سی -----

——— گولی نے ساری کائنات میں ہل چل مچادی ——— اُس کا سہاگ لُٹ گیا۔ چوڑیاں پھوٹ گئیں ——— مانگ بکھر گئی ——— کوئی نہیں ——— کوئی بھی نہیں ——— آگے نہ پیچھے ——— اکیلی جان ——— ایک حمدل مزدور نے اُس کو بہن بنا کر اپنے یہاں عارضی طور پر پناہ دے دی ——— مگر چند دن بعد وہ بھی گرفتار ہو گیا ——— اس کے بعد وہ باہر نکلی ایک شریف پردہ دار عورت ——— جس نے اس سے پہلے کسی غیر مرد کی صورت بھی نہ دیکھی ہو وہ مزدوری کرنے گئی ——— ایک بڑھیا کو اس پر رحم آیا ——— اللہ راہ پہ اس نے اپنے یہاں جگہ دے دی ——— چند دن وہاں رہی ——— ایک جوان اور خوبصورت عورت کو دیکھ کر محلّہ والوں نے اُس کو تنگ کرنا شروع کر دیا ——— رات کی تاریکیوں میں جب بڑھیا سو جاتی تو کوئی نہ کوئی آتا ——— اور تقریباً ہر روز نیا اور اُس کو ——— وہ
126 کسمساتی ——— چلّاتی ——— شور مچاتی ——— بڑھیا کو آوازیں دیتی ——— مگر بڑھیا کی آنکھ نہ کھلتی وہ ایسی سوتی کہ صبح ہی اُٹھتی ——— تنگ آکر وہ اس بڑھیا کے پاس سے بھاگ کھڑی ہوئی ——— اس کے بعد وہ جہاں بھی گئی ——— اُس کے سامنے یہی سوال پیش ہوا ——— اُس کے لئے اپنی خوبصورتی اور جوانی وبال بن گئی ——— جس آگ سے وہ بچنا چاہتی تھی۔ وہی آگ ہر جگہ اُسے اپنے اردگرد حلقہ بنائے ہوئے ملتی اور خیر سے کوئی اس کو اپنی بیوی بنا کر رکھنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا۔ بس پیسہ لو اور راستہ پکڑو ——— در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے باوجود اُس کے لئے کوئی ٹھکانا نہ تھا ——— میرے اللہ رحم کر! ——— مگر اللہ کو اس پر رحم نہیں آیا ——— اور رحم آتا تو کس طرح ——— ؟ کوئی بات بھی رحم کی ——— یوں ہر کس و ناکس پر وہ رحم فرمانے لگے تو ہو ہی چکا ——— پھر قسمت کا لکھا کیسے پورا ہو ——— !

— الغرض ایک مرتبہ کی بھٹکی ہوئی روح پھر اپنی منزل پر نہ پہونچ سکی تو اس نے اپنی شاہراہ ہی بدل دی — اُنا گرخود کو اُس نے چکلے کے حوالے کر دیا — جب بھی — ہے تو یونہی سہی — یہاں اُس کا ڈاکٹری معائنہ ہوا — کمپونڈر نے گھر بُلا کر دیکھا اُس کا ایک ایک عضو — کہیں کوئی خرابی تو نہیں — چکلے کے ٹھیکیدار نے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کر دیئے — اُس کے بعد سے آج تک وہ اسی طرح چکلے میں بیٹھی — اپنا من — اپنا تن اور جسم میں چھپی ہوئی موت بیچ رہی ہے — سرِ راہ — علی الاعلان — شروع شروع میں تو اس کا بازار کافی گراں رہا — لیکن آہستہ آہستہ گرنے لگا اور آج — نئی بیویوں کے پُرانے شوہروں نے نئے روپ دھار لئے — سب کو گویا اس سے نفرت ہو گئی — اوراب جب کبھی وہ اپنے ماضی کی طرف نظر ڈال کر دیکھتی ہے تو بسیط اندھیارے دل ۱۲۷ کے سوا اُسے کچھ نہیں دکھائی دیتا — وہ مایوس ہو جاتی ہے — گزرے ہوئے لمحات — بیتی ہوئی باتیں — پچھلے واقعات اب اس کے لئے کھلونوں سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتے — تنہائیوں میں اکثر وہ ان سے دل بہلایا کرتی ہے —

پھر جب وہ سوچتی ہے کہ وہ اگر ذرا سی سمجھداری اور سوجھ بوجھ سے کام لیتی تو آج کسی کے دل کی ملکہ ہوتی — کسی پر اُس کا زور ہوتا — دنیا کے سامنے گردن اُٹھا کر چلتی — مگر اب — !

وہ آ کر پھر دریچے کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے — اُس کا دل گھڑی کی طرح ٹِک ٹِک کر رہا ہے — وہ فوراً آنکھیں بھینچ کر سامنے والی بلڈنگ کو گھورتی ہے — اس وقت وہ قطعی خالی الذہن ہے البتہ آنسو برابر بہے جا رہی ہیں۔

اعصاب میں تشنج ہو رہا ہے ——— وہ سوچنا چاہتی ہے مگر خیالات جمع ہو کر بے ربط کڑیوں کی طرح بکھر جاتے ہیں اور اکیلی رہ جاتی ہے ——— تن تنہا ——— خالی الذہن ——— پھر آنکھوں کے سامنے بلڈنگ کی چوٹی سے ایک نقطہ ابھرتا ہے جو بڑھتے بڑھتے اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ گھبرا کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ——— نقطہ پھیل کر ایک لفظ بن جاتا ہے ——— بھوک ——— کیسے بجھائے، کیسے مٹائے ——— اس کی باچھوں سے رال بہہ رہی ہے ——— دماغ میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں!

"قائد اعظم ——— زندہ باد!"

"پاکستان ——— لے کے رہیں گے!"

یکایک فضا میں شور بلند ہوتا ہے اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے ——— ١٢٨

"میرا [illegible] بھی ہے۔ کہاں ہے؟"

"جاوید ———!" آواز حلق میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

بہت سے آدمی ہرا جھنڈا اٹھائے چلے جا رہے ہیں ——— یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرتا ہے ——— نہیں نہیں یہ سڑک کبھی نہیں سو سکتی ——— ذہن کی روشنی زندگی کی تاریکی میں ——— یہ جاگتی رہے گی ——— اس کی بھوک کی طرح سدا بیدار ——— جب تک انسان کا ذہن زندہ ہے ——— اس کی تخلیقی قوتیں زندہ ہیں اس کے [illegible] ——— اسے کوئی نہیں سلا سکتا ——— یہ کبھی نہیں سو سکتی جینے کے لئے [illegible] کے مانند ——— دھیرے دھیرے وہ فلسفی ہوتی جا رہی ہے ——— اس کا شعور [illegible] ہو کر پڑا [illegible] رہا ہے اور لاشعور آہستہ آہستہ

بیدار ہو رہا ہے۔

اچانک دوسرا جلوس سامنے سے برآمد ہوتا ہے —— اکھنڈ ہندوستان اور بھارت ماتا کی جے جے کار اپنے جلو میں لئے ہوئے —— ہمارا قومی نعرہ —— جے ہند —— ہندوستان ہمارا ہے —— دونوں جلوس آپس میں گتھ جاتے ہیں —— لاٹھیاں چلتی ہیں —— چھرے گھونپے جاتے ہیں اور اوپر والی منزل سے لوگ اینٹیں —— پتھر —— سوڈے اور تیزاب کی بوتلیں پھینکتے ہیں —— کوئی کسی کا پرسان حال نہیں —— میدان کارزار سے زیادہ خطرناک منظر ہے —— زخمیوں کی چیخ و پکار —— آہ و بکا —— جے ہند اور اللہ اکبر کے نعروں کو چیرتی ہوئی آسمان کی وسعتوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آتی ہے —— محلہ کی بسنے والیاں اپنے اپنے گھروں کے کواڑ بند کر لیتی ہیں —— بلب بجھا دیتی ہیں —— ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں —— مارے خوف کے بہت سی آوازیں ان کے حلق میں آکر گھٹ جاتی ہیں —— بعض چوری چوری دریچوں کے شیشوں سے جھانک کر دیکھتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پولیس کی لاری سے ایک مسلح دستہ اتر کر اس بے پناہ ہجوم پر فائرنگ کرتا ہے —— گولیاں چلنے کی آواز کے کوئی دس منٹ بعد فضا میں پھر وہی سکوت پھیل جاتا ہے —— ایمبولینس کاریں زخمیوں کو اٹھا کر چلی جاتی ہیں —— لیکن وہ ابتک خاموش کرسی پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی ہے —— اس کو کوئی غم نہیں —— کوئی شکوہ نہیں —— کوئی شکایت نہیں —— بس اسے افسوس ہے کہ سڑک پھر سنسان ہو گئی —— کوئی نہیں —— کوئی نہیں —— ایک کتا بھی نہیں —— خوف ہی خوف ہو —— انسانی خون

جس کی خاطر لوگ چوریاں کرتے ہیں ڈاکے ڈالتے ہیں ــــ عصمتیں بکتی ہیں ــــ آبروؤں کا سودا ہوتا ہے ــــ قسمتوں کے فیصلے کئے جاتے ہیں ــــ یہ سوچتے ہی اس کے ذہن کی نامعلوم گہرائیوں سے نفرت و حقارت کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے ــــ البتّہ وہ نہیں جانتی کیوں ــــ اور کون ہے اس نفرت و حقارت کا مرکز ــــ وہ سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگتی ہے ــــ کیا ہو گیا ہندوستان کو ــــ پہلے تو کبھی نہیں ہوتا تھا ایسا ــــ !

ــــ وہ دیکھتی ہے ــ سامنے والی گلی کے نکڑ سے ایک دُبلا پتلا آدمی نمودار ہوتا ہے اور چوروں کی طرح ادھر اُدھر دیکھ کر سڑک کو پار کر کے دوسری گلی میں جانا چاہتا ہے کہ اس اونچی بلڈنگ کا دروازہ کھلتا ہے ــــ اور ایک

۱۳۰ شخص نکل کر اُس کی پُشت کی طرف سے پیٹ میں چھُرا گھونپ کر پھر اسی دروازے میں گھُس جاتا ہے ــــ دُبلا پتلا آدمی زخم کھا کر ایک دردناک چیخ مارتا ہوا بھاگتا ہے اور عین اس کے کوٹھے کے سامنے آ کر اوندھے منھ گر جاتا ہے ــــ اُس کے حلق سے پھر چیخ نکل جاتی ہے چیخ کی آواز کے ساتھ فضا میں ایک نئے دردار سیٹی کا شور گونجتا ہے ــــ وہ دیکھتی ہے ــــ اس بے قصور انسان کی کمر سے خون کی دھاریں بہہ رہی ہیں ــ ایک لمحہ کے لئے اس پر جھرجھری طاری ہو جاتی ہے ــــ وہ نگاہیں چُرا کر گلی کے نکڑ کی طرف دیکھتی ہے جہاں ایک مبہم سا سایہ لہرا رہا ہے !

پانی ــــ! پانی ــــ!! وہ چیختا ہے ــ کون ہے جو اُسے پانی پلائے ــــ کون ہے جو اُس کی مدد کرے ــــ کون ہے جو اپنی جان خطرہ میں

ڈالے ــــ لیکن اُس کی دردناک فریاد اور تکلیف دہ حالات اُس سے نہیں
دیکھے جاتے ــــ وہ گریز کرنا چاہتے ہوئے بھی گریز نہ کر سکی ــــ ایسے عالم میں
جب کہ نیچے اترنا موت کو دعوت دینا ہے۔

میرا پوچھتی ہے ــــ "کہاں جا رہی ہو؟"

وہ کہتی ہے ــــ "پانی پلانے!"

"نہ جاؤ چھمّی ــــ مت جاؤ ــــ وہ دیکھو پولیس والا خونخوار بھیڑیے کی
طرح تاک میں لگا ہوا ادھر ہی آ رہا ہے ــــ سنو ــــ مت جاؤ ــــ
ایسی نیکی سے ــــ!"

لیکن وہ نہیں سنتی ــــ نیچے اتر کر وہ اس کے حلق میں پانی ڈالتی ہے ــــ
پانی کا ایک گھونٹ پیتے ہی وہ جاں بحق ہو جاتا ہے ــــ جانے کون تھا بیچارہ
۱۳۱ ہندو یا مسلمان ــــ! وہ سوچتی ہے ــــ دفعتہً اس کے دل میں
ایک موہوم سا خیال ابھرتا ہے ــــ وہ ادھر ادھر دیکھ کر مرے ہوئے
انسان کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتی ہے ــــ بیڑی کے بنڈل اور ماچس کے
خالی کھوکھے کے سوا کچھ نہیں نکلتا ــــ وہ دوسری جیب ٹٹولتی ہے لیکن
قبل اس کے کہ وہ کچھ نکالے ــــ گلی کے نکڑ سے ایک پولیس والا نکل
کر پہنچتا ہے!

اے ــ اے ــ کیا کرتی ہے ــــ اس کا دل دھک سے رہ جاتا ہے
وہ جلدی سے ہاتھ نکال کر بھاگنا چاہتی ہے ــــ کہ ہولناک دھماکے کی
آواز کے بعد سن سے کوئی چیز اس کی پنڈلی کو پھوڑتی ہوئی نکل جاتی ہے

وہ تیورا کر اوندھے منھ گر جاتی ہے۔ اُس کے منھ اور پنڈلی سے گاڑھا گاڑھا یاہی مائل خون بہہ نکلتا ہے ــــ میرا چلّاتی ہے ــ ہائے کیا ہوا، چھمّی کیا ہوا، ہائے ہائے ظالم کُتّے، بھیڑیے ـــــ!

میں نے کچھ نہیں کہا، میں نے کسی کو نہیں مارا، میں بھوکی ہوں، میں نے نہیں مارا، میں نے نہیں مارا ــ وہ بیہوشی کے عالم میں بڑبڑاتی ہے، بھوکی ہوں بھوکی ہوں اور خون برابر اُس کی پنڈلی سے بہہ رہا ہے، گرم گرم سرخ خون ـــــ!

لیکن صدیوں کی پیاسی دھرتی ماتا کا پیٹ ایسے بیکار اور بے مقصد خون کے چند چھینٹوں سے نہیں بھر سکتا۔ دو سو سال سے وہ ـــــ اپنے دل میں جھلک رہی تھی اور یقیناً اس کے ہردے کا خون خشک ہو چکا ہے۔ لیکن اس کو ایسے ۱۳۲ خون کی ضرورت نہیں ــــ وہ چیخ رہی ہے۔ مجھے نہیں چاہئے ایسا خون، جو بیکار ہو، جس کا نہ کوئی مقصد ہو نہ مرکز، جس میں نہ زندگی ہو نہ حرارت ــــ یہ خون میرے مصرف کا نہیں، یہ بیکار لہو یونہی بہتا رہیگا، یونہی نالیوں میں ــ سڑکوں پر گھروں میں ــ مگر میں نہیں پی سکتی ـــ میں نہیں پیونگی، ہٹ جاؤ، میری بلا سے، مجھے تم سے نفرت ہو۔ تم میری کوکھ کی اولاد نہیں۔ تم اجنبی قدموں کے نشان ہو۔ تم سامراج کے ایجنٹ ہو، تم میری موت کے درپے ہو ہائے میں مری، میں مر رہی ہوں، میں مر جاؤں گی۔ میرے ہردے کا خون خشک ہو چکا ہے!

اسد بھوپالی!

بھٹکے ہوئے انسان

ظلم کی روندی ہوئی کچلی ہوئی ٹھکرائی
زیست صدیوں رہی یوں جیسے گذرگاہِ عوام
اور چونکا بھی تو یوں نیند کے ماتوں کا شعلہ
ڈھل گئی جنگ کے سانچوں میں نئی صبح و شام

فتنہ و شر کے جنوں خیز اشارے پا کر
وقت ہاتھوں میں لئے ساغرِ زہراب آیا

خونی ہے ہندوستان

سالہا سال کی تعمیر ہے خوں میں غلطاں
وادیِ زیست میں اک موت کا سیلاب آیا

کہیں چاقو، کہیں لاٹھی، کہیں چمکیلے چھُرے
رہگذاروں پہ تڑپنے لگے زخمی انساں
آگ کے شعلوں سے سجنے لگے رنگیں در و بام
اور اُٹھنے لگا سُلگی ہوئی قبروں سے دھُواں

جہل نے چھین لیا عقل کی دیوی کا سُہاگ
گھِر گئی نرغۂ اوہام میں توریثِ یقین
سینۂ شرق سے تہذیب و تمدن کے نقوش
اِسطرح مِٹ گئے جیسے کہ کبھی تھے ہی نہیں

کبھی بھٹکے ہوئے انسانوں نے سوچا ہی نہیں
کتنی پُرہول ہے اس خوابِ گراں کی تعبیر
ابھی زنجیرِ کہن ٹوٹنے پائی بھی نہ تھی
اور اک اور بھی ہونے لگا زنداں تعمیر

رُشدی بھوپالی!

رشتے

135 نوجوان بنیتا راے خوشی میں جھومتی ہوئی دفتر سے گھر جارہی تھی ——

آج اُس نے پہلی مرتبہ دفتر میں کام کیا تھا —— اسے پہلے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس قدر سلیقہ اور فراست سے کام کر سکے گی اور تو اور دتا اینڈ سنز کے اسسٹنٹ نے جس کی وہ اسٹینو گرافر تھی بڑے تپاک سے اس کو مبارکباد دی تھی۔

بنیتا نے سوچا، ماں کتنی خوش ہوگی اور پھر اُسے رات میں ہونے والی "بزم نشاط" کا خیال آگیا۔ وہ اس اجتماع میں پہلی بار لوگوں کے سامنے آئے گی۔

بنیتا نے بہت ہی پاکبازانہ زندگی بسر کی تھی —— اس کی دنیا محدود تھی —— اُس کی بیوہ ماں بیٹی کی کڑی دیکھ بھال کرتی تھی۔ بنیتا نے آج تک ناچ میں شرکت نہیں کی تھی —— وہ اُس کو طوفانی آزادی نہیں دینا چاہتی تھی —— ماں نے اُس کو خبردار کر دیا تھا کہ جب تک وہ اپنی تعلیم ختم

کر کے روزگار سے نہ لگ جائے ـــــ اُسے عام رقص و سرود سے اجتناب کرنا چاہئے ـــــ اسی لئے وہ کسی ایسے جلسہ یا تقریب میں شریک نہیں ہو سکتی تھی ـــــ جو رات کو ہو۔

اور اب بنیتا نہ صرف ملازم ہو گئی تھی ـــــ بلکہ اس کو توقع سے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی تھی ـــــ چنانچہ "بزم نشاط" میں اس کی شمولیت اب یقینی ہو گئی تھی ـــــ!

بنیتا نے سوچا ـــــ "میں اپنا بھڑکیلا لباس پہنوں گی"

اور پھر خیال کیا "اس کے بعد میں اپنے راجیو سے ملوں گی اور ـــــ!"

بنیتا کو اچانک یہ احساس ہوا کہ سامنے سے جو لوگ آ رہے ہیں ـــــ وہ کچھ

۱۳۶ پریشان سے ہیں ـــــ کچھ لوگ تیزی سے دوڑتے ہوئے اس کے قریب سے نکل گئے ـــــ چند ایک غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے ـــ کہیں اس کی ساڑی میں تو کوئی نقص نہیں ـــــ؟ اس نے میک اپ تو زیادہ نہیں کر لیا؟ ـــــ

ـــــ اور دفعتاً اسے کچھ خیال آگیا ـــ بنیتا لرز گئی

اب اُسے معلوم ہوا کہ گلی کسی قدر سنسان ہے ـــــ اور اکّا دُکّا راہ گیر ایک ہی سمت جا رہے ہیں ـــــ!

یکایک اس کے تصورات کا محل زمین پر آ رہا ـــــ وہ ایسے علاقے سے گذر رہی ہے ـــ جس کے متعلق خطرے سے آگاہ کر دیا گیا تھا ـــــ یہاں غنڈوں کی آماجگاہ تھی اور اس سے طاعون کی طرح بچنے کو کہا گیا تھا ـــــ

اس نے اپنے ماحول کا جائزہ لیا تو وہ اس تنگ گلی میں بالکل تنہا تھی ـــــ

پنواڑی تک اپنی دُکانیں بند کر کے غائب ہو گئے تھے یہ کیوں ——؟ شاید آنے والے خطرات کے احساس نے انھیں دوکانیں بند کرنے پر مجبور کر دیا ہو؟

بنیتا تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی کُشادہ اسٹریٹ پر پہونچگئی —— جہاں سے شاہراہ بالکل قریب تھی —— بہر حال اب خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی —— مگر اس نے یہ حماقت کیا کی تھی —— اس نے خود ہی اپنے کو خطرے میں ڈال لیا تھا!

اتنے میں ایک ہجوم کا شور سُنائی دیا —— جس سے وہ کانپ گئی —— اس نے یہ آواز فوراً پہچان لی —— غالباً اُس نے پہلے بھی ایسی آواز سنی تھی ——؟ اس کی وحشت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ ہجوم نکڑ پر سے اِدھر ہی آرہا تھا۔

بنیتا فوراً سمجھ گئی کہ یہ غنڈوں کا مجمع ہے —— جو تباہی و بربادی پھیلانے ۱۴۷
کے لئے سیلاب کی طرح بڑھ رہا ہے —— اس نے دیکھا کہ ہجوم نے ایک کار روک لی اور اس میں بیٹھے ہوئے شخص کو باہر کھینچ لیا گیا اور کار میں آگ لگا دی گئی پھر اُسے کچھ نظر نہ آیا —— وہ تیزی سے اسی گلی میں مُڑ گئی جہاں سے وہ باہر نکلی تھی —— اب وہ اپنے اونچی ایڑی والے جوتے سے جس قدر دوڑ سکتی تھی برابر دوڑے جا رہی تھی —— وہ جلد از جلد اس گلی سے باہر نکل جانا چاہتی تھی تاکہ وہ حفاظت سے شاہراہ پر پہونچ جائے —— اُس نے مڑ کر دیکھا ہجوم نظروں سے دور تھا شاید وہ بچ نکلے —— وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی —— اُس کی سانس اُلجھ رہی تھی —— مگر اپنے دانتوں کو بھینچے ہوئے برابر بھاگے جا رہی تھی —— اچانک وہ رُک گئی اور مارے خوف کے اس کے چیخ نکل گئی —— ہائے اللہ کیا کروں ——؟

اس پر دہشت طاری ہو گئی اور کانپنے لگی ۔۔ اس کا دماغ پراگندہ ہو گیا ــــ
پاؤں جم گئے ــــ خوف اور اضطراب کے عالم میں وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی ــــ
ــــ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا ــــ ایک اور ہجوم گلی میں اُس کی جانب مڑ گیا تھا
ــــ اُن کے ہتھیاروں کی جھنکار ــــ چیخ و پکار اور شور و شر سے ظاہر ہوتا تھا
کہ وہ بھی غنڈے ہیں ــــ یہ دونوں ہجوم ایک دوسرے سے یا تو مل جائیں گے
ــــ یا مقابلہ کریں گے ــــ یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ان کے درمیان
گھر گئی تھی ــــ!

اچانک بنیتا کو محسوس ہوا کہ ہجوم نے اُسے دیکھ لیا ہے اور بجلی کی سی تیزی
کے ساتھ اس کے حواس مجتمع ہو گئے ــــ ایک طرف مڑ کر پھر اس نے دوڑنا
۱۳۸ شروع کر دیا۔

اب کے وہ پہلے ہجوم کی طرف بھاگ رہی تھی ــــ جو ابھی تک نظروں سے اوجھل
تھا ــــ وہ پناہ کے لئے سر توڑ کوشش کر رہی تھی ــــ جھونپڑیاں بند پڑی تھیں
ــــ پھر بھی وہ برابر دوڑے جا رہی تھی ــــ اُس کی نظر ایک جھونپڑی پر
پڑی ــــ جہاں دروازہ پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا ــــ بغیر کچھ سوچے ہوئے
وہ اس میں داخل ہو گئی ــــ اندر پہونچکر بنیتا اندھیرے میں ہچکولے کھانے لگی ــــ
تھوڑی دیر بعد اُس نے دیکھا کہ چاروں طرف صندوقوں کے انبار لگے ہیں ــــ
وہ تیزی سے بڑھ کر ایک کونے میں پہونچ گئی اور اپنے "تنفس" کو قابو میں کرنے کے
لئے ایک طرف ٹک گئی ــــ ہجوم کی چیخ و پکار اُسے سنائی دے رہی تھی ــــ
اس کا دل خوف کے مارے تیز تیز دھڑک رہا تھا! ــــ

کیا ان لوگوں نے اسے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے ـــــ؟ کیا وہ اس کا پیچھا کریں گے ـــــ؟ وہ اس کے ساتھ کیا کریں گے ـــــ؟ کیا وہ اسے مار ڈالیں گے ـــ؟

اور اس کی ماں ـــــــ وہ کیا کہے گی ـــ؟ یہ خود اس کی غلطی ہے کہ اس راستہ سے آئی ـــــ ماں نے صبح ہی اس علاقہ میں آنے سے منع کر دیا تھا. حالات کے پیشِ نظر فساد کا خطرہ لازمی تھا ـــــ اُفوہ ـــــ! وہ کہاں بھول گئی ـــ؟ وہ جلد گھر پہونچنے کی کیوں اس قدر متمنّی تھی ـــــ؟ تاحال ۹ ½ بجے تھا اور دفتر سے جب وہ روانہ ہوئی اُس وقت صرف ۵ بجے تھے ـــــ شاہراہ سے گھر پہونچنے میں اُسے آدھ گھنٹہ اور لگ جاتا تھا ـــــ اس میں کیا قباحت تھی وہ گھر تو سلامتی سے پہونچ جاتی.

۱۳۹

یہ سب اسی کا قصور ہے ـــ جس کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑ رہا ہے ـــــ لیکن اب وہ کیا کرے ـــــ؟

بنیتا آہستہ آہستہ رونے لگی ـــ آج اُسے کس قدر مسرّتوں کی توقع تھی ـــــ لیکن اس کے بجائے یہ بپتا پڑی اور وہ ـــــ اور اسے اپنے شانہ پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا ـــــ وہ چیخ مار کر گر پڑی. اس نے حیرت سے دیکھا ـــ سامنے اس کی ہم عمر ایک لڑکی کھڑی تھی ـــ جو اسلامی لباس پہنے تھی.

لڑکی مسکرا رہی تھی ـــــ!

"کیا بات ہے بہن ـــــ؟" اس نے بنیتا سے پوچھا "تم رو کیوں

رہی ہو؟"

بنیتا ابھی تک حیرت واستعجاب کے عالم میں تھی۔ لڑکی نے بنیتا کے شانہ پر اپنا ہاتھ رکھدیا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ——— ؟" اس نے نہایت نرم لہجہ میں کہا۔ جیسے کسی بچّہ کو تسلّی دے رہی ہو اور اسی کے ساتھ گلی میں خوفناک شور کی آواز سنائی دی جس سے بنیتا لرز گئی ——— !

"اُفوہ" ! اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر چیختے ہوئے کہا "وہی ہجوم ——— یہ میرا پیچھا کر رہے ہیں !"

"کیا انھوں نے تمھیں دیکھ لیا ہے؟" مسلمان لڑکی نے پوچھا۔

بنیتا نے جلدی سے گردن ہلادی ——— اس پر پھر خوف طاری ہو رہا تھا۔ ۱۴۰
اس نے سسکیاں بھرنا شروع کردیں "وہ مجھے مارنے آرہے ہیں"

لڑکی نے بنیتا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا "مت روؤ بہن ——— ! اِدھر آجاؤ ——— !"

بنیتا ایک کوٹھری میں پہونچی۔ جو باورچی خانہ معلوم ہوتا تھا مسلمان لڑکی نے بنیتا سے اپنے کپڑے اُتار دینے کو کہا۔

"اپنے کپڑے" بنیتا نے حیرت سے پوچھا۔

اس کی نئی سہیلی نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں تم میرے کپڑے پہن لو ! یہ لو، تم میرا بُرقعہ اوڑھ لو اور میں تمھاری ساری پہنے لیتی ہوں۔

"لیکن اس سے کیا ہوگا؟" بنیتا نے پوچھا "میں بچ جاؤں گی۔ مگر وہ

تمھیں ضرر پہونچائیں گے "

مسلمان لڑکی نے قہقہہ لگایا "وہ مجھے کس طرح نقصان پہونچا سکتے ہیں۔ میرا شوہر اُن کے ساتھ ہے۔ تمہاری ساری پہننے کے باوجود وہ مجھے پہچان لے گا اور ان کو منع کر دے گا۔ اس نے اپنے کپڑے اُتارنا شروع کر دئے "انھوں نے تمھیں دیکھ لیا ہے انھیں اسلامی کپڑوں میں تم پر کوئی شک نہ ہو گا!"

ابھی دونوں لڑکیوں نے مشکل ہی سے کپڑے بدلے تھے کہ انھیں دروازہ کے باہر ہجوم کا زبردست شور وغل سنائی دیا۔ بنیتا کانپ گئی۔ مگر اس کی دوست نے اطمینان کے ساتھ اس سے کہا "یہیں ٹھہرو ـــــ ڈرو مت ـــــ وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہونچائیں گے"

لیکن بنیتا کا اچانک ماتھا ٹھنکا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا "ارے خطرے میں نہ جاؤ" اُس نے چیخ کر کہا "وہ یقیناً تمھیں نقصان پہونچائیں گے"

مگر مسلمان لڑکی قہقہہ لگاتی ہوئی کوٹھری سے باہر نکل گئی ـــــ بنیتا خوف اور دہشت سے لرز رہی تھی ـــــ اس نے ہجوم کو اندر داخل ہوتے سنا۔ اور پھر فحش نعرے ـــــ وحشیانہ قہقہے اور شدید ضربات کی آواز آئی ـــــ چند لمحے بعد سکوت طاری ہو گیا ـــــ!

لیکن لڑکی واپس نہیں آئی اور بنیتا چند منٹ انتظار کرنے کے بعد عجب شش وپنج میں مبتلا ہو گئی ـــــ وہ اپنی جائے پناہ سے باہر نکلی اور بیرونی کمرے میں آگئی ـــــ اس کی نظروں نے جو منظر دیکھا اُس سے اس کی روح

تھرّا گئی ـــــ وہ دوڑ کر آگے بڑھی ـــــ فرش پر ایک زخم خوردہ اور عریاں جسم پڑا ہوا تھا ـــــ یہ مسلمان لڑکی تھی جس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ بنیتا اس پر جھک گئی!

"ہائے اللہ! یہ انھوں نے کیا کر دیا؟"

"اپنے کو الزام نہ دو" لڑکی نے خفیف آواز میں کہا "میرا شوہر ـــــ وہ نہیں آیا ـــــ" اس کی آواز پھر بیٹھ گئی اور اُس پر غشی چھا گئی!

فوراً ہی کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور ایک نوجوان لڑکی کے قریب آ کر رُک گیا! ـــــ

"میری بیوی!" وہ چیخا "یہ کیا ہو گیا؟"

زخمی لڑکی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے مسکرائی "اس لڑکی کا ہجوم تعاقب
۱۴۲ کر رہا تھا ـــــ یہاں پناہ کے لئے آ گئی ـــــ ہم نے کپڑے بدل لئے اور ـــــ
ـــــ!"

"او خدا اُنھوں نے تمہارا یہ حشر کیا!" اس نے بنیتا پر نظر ڈالی ـــــ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا "اور تم نے یہ سب کچھ ہونے دیا؟"

"نہیں ـــــ نہیں انھیں الزام نہ دو" اُس کی بیوی نے کہا۔

"یہ تو قسمت میں لکھا تھا ـــــ!"

مگر اس کے شوہر نے چیخ کر کہا "یہ اس کا قصور ہے ـــــ تم نے کیوں مداخلت کی۔ اُسے بھیج دیا ہوتا" لڑکی نے اپنے شوہر کا ہاتھ اٹھا کر اپنے زخمی گال پر رکھ لیا۔

"نہیں ـــــ تم غلطی پر ہو ـــــ میرے سرتاج! تم بھولتے ہو، ہم بہنیں ہیں ہمارے خون کے رشتے ایک ہیں" ـــــ!

نوجوان نے زخمی گال کو دبایا۔ "اُفوہ ــــ لیکن یہ ہوا کیوں ــــ ؟"
اس کی بیوی مسکرائی "کچھ نہیں" اس کی آواز کمزور پڑ گئی۔
"یہ قسمت میں لکھا تھا" اس نے بڑی مشکل سے سانس لی اور پھر آہستہ سے کہا "تم مرد لڑتے ہو اور ہم عورتیں مصیبت جھیلتی ہیں ــــ لیکن یہ قسمت کا لکھا ہے۔ مجھے اسی طرح مرنا تھا ــــ "
اُس کی آواز فضا میں تحلیل ہو گئی اور ایک گہری سانس کے ساتھ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں ــــ مسکراہٹ ابھی تک اُس کے سُرخ ہونٹوں پر کھیل رہی تھی ــــ!!!

عنبر چغتائی!

پس منظر!

عالمِ آرزو و یاس کو سمجھیں کہ نہیں ؟
تم مری تلخیِ احساس کو سمجھیں کہ نہیں ؟

طعنِ بیگانہ روی و روشِ سنگ، مجھ پہ
بات کچھ بھول گئی جس سے مشیت کہہ کر
ہاں تمہارے یہ گلے شکوے سر آنکھوں پہ مگر

ماورائے غمِ الفت ہی کوئی اور بھی شے
نغمۂ مطربِ ایام کی ہے اور بھی لے
ساغرِ ساقیٔ دوراں میں ہے کچھ اور بھی مے

اور وہ مے ہی بہت تلخ مری نوشینہ!
کیا بتاؤں مرا داغوں سے بھرا ہے سینہ
ملک اور قوم کے حالات تو ہیں آئینہ

جنگ کا حادثہ حال سنا تو ہوگا
کیوں بہت آج ہے پامال سنا تو ہوگا
کال بنگال کا یہ کال سنا تو ہوگا

ننگ ناموس شرافت کو کھلے سر دیکھا
مطلع عصمت و عفت کو مکدر دیکھا
میں نے انسان کو درندہ سے بھی بدتر دیکھا

تھی جو باہر ہو وہی ملک کے اندر حالت
اور مانگ ہی فسادوں سے برابر حالت
عالم امن میں ہی جنگ سے بدتر حالت

یہ ترقی تمدن کا یہ تہذیب کا دور
دہشت انگیزی و غارتگری و قتل کے طور
زندہ قوموں کی بقا کا ہی قرینہ کچھ اور

پھر بھی دکھا رہی یہ حاشیۂ ابر سیاہ
میرے مستقبل تابندہ، مری سمت نگاہ ۰

محمد علی تاج!

خونریزیوں کے نام!

جو سوئے تو صدیوں سے سوئے ہوئے تھے
سفینے کو اپنے ڈبوتے ہوئے تھے

جو جاگے تو اپنے ہی گاؤں پہ لپکے
بزرگوں پہ بہنوں پہ ماؤں پہ لپکے

مساجد۔ منادر۔ مقابر پہ حملے
موذن۔ پجاری۔ مجاور پہ حملے

یہ بچوں کی چیخیں یہ ماں کی پکاریں
یہ آہوں کے جھرنے یہ خوں کی پھواریں

کیا پیار یوں شیرخواروں سے تم نے
انھیں چیر ڈالا ہے آروں سے تم نے

یہ سردی میں اکڑے ہوئے جسم ان کے
یہ چوٹوں سے جکڑے ہوئے جسم ان کے
زبانوں میں لکنت سی آئی ہوئی ہے
نگاہوں میں دہشت سمائی ہوئی ہے
وہ قومیں زمانے کی لعنت سہیں گی!
جو اپنے پڑوسی کی دشمن رہیں گی!
یہ دعوے غلط ہے کہ بیدار ہو تم!
کہ کتّوں کے خوابوں کے کردار ہو تم!

سلمان الارشد فاروقی

طنز

پیاسی دھرتی

١٤٩ [اگر میں ایشیائی کانفرنس میں کسی غیر ملک کے نمایندہ کی حیثیت سے شریک
ہوتا تو کانفرنس میں ہندوستان کے بارے میں اپنے ان تاثرات کا اظہار
ضرور کرتا]

ڈاروِن کی تحقیق تھی کہ انسان پہلے بندر تھا مگر موجودہ تجربات نے یہ ثابت
کر دیا ہے کہ انسان بندر نہیں بلکہ پہلے درندہ تھا اور تمدن و تہذیب کی پالش
نے عرصہ تک اس کی اس درندانہ بہیمیت کو چھپائے رکھا مگر یہ رنگ پختہ نہ ہونے کی
وجہ سے جلد ہی اڑ گیا اور اس کی اصلی حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو گئی۔

چنانچہ آج یہ درندے پوری آزادی کے ساتھ بنگال، بہار، بمبئی، دہلی
اور پنجاب میں پھر رہے ہیں ایسے درندوں کی پہچان میں کوئی خاص دقت نظر

نہیں آتی ہے اُن کے مگر وہ چہرے جن پر سفاکی زردی کی صورت میں کھنڈی ہوئی ہے اُن کو شناخت کرنے میں پوری پوری مدد دیتی ہے۔ سرزمین بنگال! جہاں لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں کی ذہنیت پر ڈاکہ ڈالا تھا اور میر جعفر جیسے غدار نے جہاں جنم لیا تھا اس موقعہ پر سب سے پہلے ان درندوں کی نمائش کرکے یہ ثابت کردیا کہ بنگال ہندوستان کا قلب ہے وہ دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے اور صوبہ بہار نے بھی اسی وقت اپنے ہمسائے کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھا اور نتیجہ میں ہندوستان کے سادہ نقشہ پر خون کے دھبوں نے ایسی حسین بچہ کاری کی کہ جنگ میں حصہ لینے والے ممالک بھی اس نقشہ کو دیکھ کر تڑپ اُٹھے اور اُن کو یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑا کہ ہندوستان کی دھرتی کو بہادروں کے جنم دینے میں مہارت حاصل ہے۔ ۱۵۰

معلوم نہیں اس مقدس سرزمین پر ایسے کتنے ہی سورما جنم لینگے اور جنم لینے کے بعد اپنی دلیری سے ہندوستان کا نام روشن کرتے رہینگے۔ اکھنڈ ہندوستان یا پاکستان بنے یا نہ بنے مگر یہ سورما ہندوستان کی برسوں کی پیاسی دھرتی کی خونی تشنگی دور کرکے اس کلنک کے ٹیکہ کو ضرور مٹا دینگے جو برسوں سے غلامی کی وجہ سے اُن کی پیشانی پر جگمگا رہا ہے۔ ہندوستان کی دھرتی خون پینے کی عادی ہو چکی ہے۔ یہاں کے سورماؤں نے اس کو کبھی پیاسا نہیں رکھا مہابھارت کی لڑائی بیرونی حملہ آوروں کے حملے۔ نادرشاہ کا نادرشاہی حکم راجپوتوں کی لڑائیاں ہمیشہ اس دھرتی کے لئے خون فراہم کرتی رہی ہیں یہ دوسری بات ہے کئی سو سالہ غلامی نے اُن کو خون بہانے کا موقعہ نہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی

سے یہ فرض سفید فام آقا ادا کرتے رہے اور گولیوں و لاٹھیوں کے ذریعہ سے
جس قدر خون بہانا ممکن تھا بہایا گیا۔ جلیانوالہ باغ کی دھرتی تو اس زمانہ میں بھی
پیاسی نہیں رہی مگر دوسرے حصے اس فیاضی سے محروم رہے شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اس زمانہ
میں ہندوستانیوں کے جسموں میں خون نہیں رہا تھا یہ وجہ نہیں کہ خون کی پیداوار کم ہو گئی
تھی بلکہ جسقدر بھی خون پیدا ہوتا تھا اسکو سفید فام آقا پی جاتے تھے اور جو رہا سہا
باقی بچتا تھا وہ سرمایہ دار چوس لیتا تھا جونک یا کھٹمل بن کر جونک اور کھٹمل کے نام اب
بدل گئے ہیں موجودہ تہذیب اب ان کو مل مالک یا مہاجن کے نام سے پکارتی
ہے شاید اس لئے پیاسی دھرتی کی پیاس کا خیال یہ سورما نہیں کر سکے۔ مگر
اب جبکہ ہندوستان بیدار ہو چکا ہے وہ آزادی کی منزل کی تیزی سے بڑھ رہا
ہے جب تقریباً اپنوں کی حکومت ہو چکی ہے تو ماں کے یہ فرمانبردار فرزند اپنے 151
سعادت مندانہ فرائض سے کیسے غافل رہ سکتے تھے ان کو ماں کی پیاس دور کرنا تھی اور
وہ اسی طریقے سے دور ہو سکتی تھی۔ اب خون کی بھی اس قدر کمی نہیں رہی ہے کیونکہ اب خون
پیا نہیں جاتا بلکہ صرف چوسا جاتا ہے۔ اور جو چوسنے میں کچھ نہ کچھ باقی بچ ہی جاتا ہے
یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی ہندوستان کی دھرتی خون پیتے پیتے جونک پٹتی ہے
اور کہتی ہے کہ اے سعادتمند بچو! شاید تم اپنے بھائیوں کا خون مجھے پلا رہے
ہو۔ ماں بیٹوں کا خون کیسے پیئے یہ بہادر بڑھیا ماں کی اس بات پر بھلا اٹھتے
ہیں اور ترشی سے جواب دیتے ہیں کہ بھوک پیاس میں اپنا پرایا غیر اور بھائی
کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی اگر یہ تخصیص ہوتی تو بنگال کے قحط میں مائیں ایک مٹھی
چاول کیلئے اپنے بچوں کو ہرگز ہرگز نہ فروخت کرتیں نہ بھائی چند دانوں کیلئے

اپنی بہنوں کی عصمتیں نیلام کرتے نہ بیٹے ماؤں کے جسموں کو چند لقموں پر نچھاور
کرنے کی جرأت کرتے۔ یہ خودغرضی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے
بھائی کے لئے بھائی کا خون بہانا کوئی گناہ نہیں کیا ہابیل و قابیل بھائی
نہیں تھے، کیا کورو پانڈوں کے برادرانہ رشتہ کو فراموش کیا جا سکتا ہے؟
ہندوستان کی دھرتی یہ مدلل جواب سُنکر خاموش ہو جاتی ہے کیونکہ اب اُسکے
منھ کو بھی خون لگ چکا ہے۔ ابھی تک مختلف ذائقوں کی لذت اسے یاد ہے
مغلوں اور راجپوتوں کے خون میں کس قدر چٹخارہ تھا وہ اس مزہ کو فراموش نہیں
کر سکتی یوں تو خون پینے کی شوقین صرف ہندوستان ہی کی دھرتی نہیں ہے بلکہ یورپ
روس جاپان تقریباً دنیا کے ہر ملک کی زمین خون پر پلی ہوئی ہے اسے چھوڑ
دیجئے کہ روس کی سرزمین صرف سرمایہ داروں کا خون پیکر خوش ہوتی ہے یا 152
انڈونیشیا اور چین کی دھرتی ان دشمنوں کا خون پی کر مسرور ہوتی رہی ہے جو ان آزاد
انسانوں کی طرف فولادی زنجیریں لیکر صرف اس لئے بڑھ رہے ہیں کہ غلامی
کی رسم کی تجدید ہوتی رہے کہیں ایسا نہ ہو کہ لفظ غلامی لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائے
حالانکہ لفظ غلامی کی حفاظت کرنے اور اس کی آبرو بچانے کی سب سے زیادہ
کوشش اگر کسی قوم نے کی ہے تو وہ انگریز قوم ہے اور اس نیک قوم کے
اس پاکیزہ جذبہ کی اگر کوئی صحیح معنوں میں سچی قدر کر سکا ہے تو وہ صرف ہندوستان
ہی کیونکہ اس سرزمین کا انسان دوسروں کے جذبات کو بیحد ملحوظ رکھتا ہے۔ اور
مہمان نوازی کے معاملہ میں تو اس کو دور دور شہرت حاصل ہے اگر یقین نہ ہو
تو مغل تاریخ کے سب سے بڑے شہنشاہ اکبر اعظم کی اس مہمان نوازی کو

یاد کیجئے جو اس نے سفید فام آقاؤں سے کی۔ مشہور ہے کہ بعض بعض وحشی قبائل اپنے مہمانوں کی خدمت میں اپنی بیگمات تک کو پیش کر دیتے ہیں مگر ہندوستان نے اس سلسلہ میں ان وحشی قبائل سے بھی زیادہ فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنا گھر تک مہمان کو بخش دیا۔ شاید حاتم طائی کی روح بھی اس سخاوت پر تڑپ اُٹھی ہوگی۔ یہاں کا ہر شخص حاتم طائی ہے کیونکہ یہ عمل پہلی مرتبہ نہیں ہوا بلکہ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ اس جذبہ کا مظاہرہ متعدد بار کیا جا چکا ہے۔ یہ اس ملک کی پرانی ریت ہے۔ ڈراوروں نے سب سے پہلے آرین قوم کو اپنا ملک دیکر ہندوستان کی سخاوت کا ڈنکا دنیا بھر میں پیٹ دیا تھا اور یہاں کے باسی جب سے آجتک اس پرانی ریت کا پورا پورا احترام کر رہے ہیں۔ مگر اب سخاوت کے اس نیک جذبہ کو فنا کرنے کے لئے ہندوستان میں چند بخیل بھی پیدا ہو گئے ہیں جو اپنا ملک واپس ۵۳ لینا چاہتے ہیں جو مہمانوں کو کسی قیمت پر بھی اب برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں یہ سر پھرے کہتے ہیں کہ مہمان کو ہندوستان سے چلا جانا چاہئے۔ ہمارے آبا و اجداد نے جو سخاوت کا مظاہرہ کیا وہ اصولاً غلط تھا۔ آپ ان دیوانوں کی باتوں کا اعتبار نہ کیجئے۔ ہندوستانی بیوقوف نہیں ہیں وہ اپنے مہمانوں کو کبھی خود نہیں نکالینگے وہ باپ دادا کے کئے کرائے پر پانی نہیں پھیرینگے اگر مہمان ان سر پھروں کی باتوں پر بُرا مان کر جانے کو تیار بھی ہو گئے تو اُن کو روکنے کی کوشش کی جائیگی۔ صرف مہمان کے ایک مرتبہ یہ کہدینے پر کہ وہ چلے جائینگے یہاں کے مہمان نواز میزبان گھبرا گئے پریشان ہو گئے انھوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر مہمان کو روکنے کی کوشش کی اور جب مہمانوں نے اس خوشامد کے باوجود رہنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی تو انھوں نے

مہمان کو روکنے کیلئے ایک دوسری کوشش شروع کردی یہ فرقہ وارانہ فسادات دراصل
مہمان کو روکنے کے سلسلہ کی ایک کڑی ہیں شاید مہمان انتظام اور میل ملاپ کی
خاطر ہی رک جائے۔ مہمان ہندوستانیوں پر بار نہیں ہے بلکہ وہ ان کے یہاں
ٹھیر کر اُن پر احسان کر رہا ہے کیونکہ اگر یہ محسن اعظم چلا گیا تو ایک فرقہ کا خیال ہے کہ
ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا اسی لئے غیر شعوری طور پر اسکی یہ خواہش
ہے کہ مہمان رک جائے گو اس فرقہ کے چند آدمی نعلیوں کے میل مروت کی وجہ سے
کہتے ہیں کہ تم چلے جاؤ مگر مہمان کو چاہیئے کہ وہ ان زبانی باتوں پر دھیان نہ دے چاہے
یہ کتنے ہی زور سے چیخیں کہ "جاؤ نکل جاؤ" یہ صرف سطحی نالے ہیں ان نعروں میں
دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا کوئی جذبہ شامل نہیں ہے یہ تو صرف خالی خولی نعرے
ہیں جو اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں ان سے ذرہ برابر متاثر ہونے کی ضرورت ۴۵۱
نہیں ان میں کوئی صداقت نہیں ہے خود یہ نعرے لگانے والے بھی جانتے
ہیں کہ ان نعروں کو حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ ان نعروں سے
زیادہ اسٹیشن کی ان آوازوں کو اہمیت حاصل ہے جو ہندو چائے اور مسلم
چائے کی شکل میں نکل کر پلیٹ فارم سے ہوتی ہوئی ریل کے ڈبوں میں جا کر
تحلیل ہو جاتی ہیں۔ دوسرا فرقہ بھی اس محسن کی موجودگی ضروری سمجھتا ہے کیونکہ وہ
جانتا ہے کہ اگر مہمان چلا گیا تو اس پر ظلم و ستم کی زیادتی ہو جائیگی۔ اکثریت اقلیت
کو کچل کر رکھ دیگی کیونکہ اکثریت بہرحال اکثریت ہے اور اقلیت پھر اقلیت مگر ان
اکثریت اقلیت کے اصول سے مستثنےٰ ہے اس کی اقلیت مہمان ہونے کی بنا پر
اکثریت کے مترادف ہے جبھی تو وہ چالیس کروڑ جیسی عظیم الشان اکثریت

پر چالیس ہزار نفوس کی اقلیت کے ذریعہ حکومت کر رہا ہے اور شاید کرتا رہے
صرف اس لئے کہ ہندوستان کے چالیس کروڑ انسان گائے کی طرح سیدھے
سادھے ہیں کیونکہ گائے کو اس ملک میں مقدس سمجھا جاتا ہے اسی تقدس کی بنا پر
اس کی یہ صفت یہاں کے انسانوں نے اپنالی ہے۔ چنانچہ گائے کی گلوں کی
طرح جنکو چند چرواہے کافی ہوتے ہیں ان کو بھی مٹھی بھر افراد ہانک سکتے ہیں۔ یہاں
ہندوستانیوں کے اس سیدھے پن کا ہمیشہ قائل رہا ہے اور ان فسادات
میں بھی ان کو کافی دخل ہے۔ چنانچہ یہاں کے قائدین جو سوچتے کم اور کھاتے زیادہ
ہیں ہندوستانیوں کی اس ذہنیت کو بہت پسند کرتے ہیں اور اس بے زبان مخلوق
سے ان کو کام لینے میں کوئی زیادہ دقت نہیں ہوتی یہاں کی مخلوق میں دیوانگی کے
آثار بھی کافی پائے جاتے ہیں۔ مگر صرف مذہب تک یہ جنون محدود ہے۔ اس سے
کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ خدانخواستہ یہ مذہبی تعلیمات پر عبور رکھتے ہیں یا اس پر عمل
کرتے ہیں۔ نہیں نماز یا پوجا سے ان کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ چوری ڈاکہ زنی
زنا، خیانت اور جھوٹ مذہبی اعتبار سے تو دونوں فرقوں کے یہاں ناجائز ہے
مگر حالات کے لحاظ سے اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے مذاہب میں
کافی لچک پیدا کر لی ہے البتہ مذہب کے سلسلہ میں ان کی نظریں بہت تیز ہیں کیونکہ
انکو اپنا مذہب اور دھرم ہمیشہ خطرے میں نظر آتا ہے۔ بلکہ مولوی صاحب اور
پنڈت جی کو تو اکثر اپنے مذاہب کے ایوانوں کی اینٹیں تک لرزتی نظر آجاتی ہیں
اور جب کبھی یہ زلزلہ کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو ملک وملت کے یہ ہمدرد
فلک شگاف نعرے لگا لگا کر اپنی اپنی قوموں کو آنے والے خطرے سے مطلع کر دیتے

ہیں اور پھر اس زلزلہ کو روکنے کے لیئے لاٹھی ڈنڈے، چھرے تلواریں اور سوڈا واٹر کی بوتلوں کا پوری پوری فیاضی سے استعمال ہوتا ہے تب کہیں جا کر یہ زلزلہ رکتا ہے اور مذہب کے کانپتے اور ڈگمگاتے ہوئے ایوانوں کی بنیادیں از سر نو کچھ عرصہ کے لیئے مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے زلزلوں کے جھٹکے سال بھر میں دو تین مرتبہ ضرور محسوس ہوتے ہیں۔ البتہ معمولی جھٹکوں کو روکنے میں دفعہ ۱۴۴ اور کرفیو آرڈر ہی کافی ہوتا ہے۔ زلزلے کے زمانہ میں خادمان ملک وملت کے بیانات اخبارات میں بڑے طمطراق سے شائع ہوتے ہیں بیان دینا بھی اس ملک کی ایک خاص خصوصیت۔ بیماری آزاری سے لے کر شادی بیاہ اور موت تک کے معاملات میں یہاں کے لیڈران کرام بیان دینا ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ فسادات کے بارے میں بھی یہاں کے قائدین نے بیانات کی بھرمار کر کے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور خدمت کو بجا لانے میں ہندوستان کے اخبارات نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے رضاکارانہ طور پر یہاں کے صحافیوں نے فسادات کی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سی معمولی خبر کو زیادہ سے زیادہ اہم بنا کر پیش کیا اور مذہب کا واسطہ دے کر پیاسی دھرتی کی پیاس بجھانے کی اپیل کی ان اپیلوں سے ہندوستانی بہادر کافی متاثر ہوئے اور پوری خوش سلیقگی کے ساتھ انھوں نے نہ صرف دھرتی کی اس خونی پیاس کو فرو کرنے کی کوشش کی بلکہ اپنے اپنے مذاہب کی تعلیمات کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ معاشی نقطۂ نظر سے بھی یہ بہادر شکریہ کے مستحق ہیں کیونکہ اُن کی وجہ سے غذائی مسئلہ کو حل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ہندوستان کے وہ لاکھوں باشندے جو غذائی بحران کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مرتے مذہب کے نام پر شہید ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے زندہ جاوید

ہو گئے۔ یوں تو ہندوستان بھی زندہ جاوید ملک ہے۔ یہ اس کی مستقل زندگی کی
علامت نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ غلامی کے باوجود زندہ ہے اس کے افراد زندہ ہیں
ان کی غلامانہ ذہنیت زندہ ہے لارڈ میکالے کی تعلیم زندہ ہے مغربی تہذیب و
تمدن زندہ ہے ایسے ملک میں جہاں اس کے زندہ رہنے کا امکان ہی نہیں تھا
البتہ اس زندگی کے باوجود اگر کوئی چیز زندہ نہیں ہے تو وہ ہے انسانیت۔ انسانیت
واقعی یہاں مر چکی۔ گو تھی وہ بڑی سخت جان۔ بڑی مشکل سے سسک سسک کر
اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس کا دم نکلا ہے۔ اب بھی اکثر قبرستانوں اور مرگھٹوں میں
اس کی ہڈیاں مل جاتی ہیں۔ ہزاروں من مٹی کے نیچے دبنے اور سیکڑوں گٹھے لکڑیوں
کے جلنے کے باوجود اس کی ہڈیاں نہ جل سکیں اور نہ گل سکیں مگر اس کا امکان ہے
کہ یہ ہڈیاں چند سال کے بعد نیست و نابود ہو جائینگی۔ مگر بہت اچھا ہوا کہ انسانیت ۱۵۷
مر گئی! ــ انسانیت اگر زندہ رہتی تو یہ فرقہ وارانہ فساد کیسے ہوتے؟ قائدین دلوں
پر کیسے حکومت کرتے اور مذہب کی عظمت کا ڈھنڈورہ کیسے پٹتا۔ بہادر اور بزدلی
کی تفریق کا اندازہ کس طرح ہوتا اخبارات میں اتحاد باہمی کی اپیلیں کیسے شائع ہوتیں
سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان کی اسکیموں کی تخلیق کیسے
ہوتی۔ "لیکے رہینگے پاکستان یا ہندوستان اکھنڈ ہے" کے نعرے کس طرح لگتے
قائدین کے مشترکہ دستخطوں سے باہمی میل ملاپ کے بارے میں بیانات کیسے دیئے
جاتے؟ ہندوستان کے قائدین رواداری کے بیحد قائل ہیں وہ ہندوستان ہی
بلکہ ایشیا کے تمام ملکوں کو ایک لڑی میں پرونا چاہتے ہیں ان کی نیت کے خلوص اور
وسعت دل کا اندازہ ایشیائی کانفرنس سے کیا جا سکتا ہے جس میں آج مس نکڑا ہو

ہندوستان کے بارے میں اپنے ان تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں یہ دوسری بات ہے
کہ جس روز اس کانفرنس کا پہلا اجلاس ہو رہا تھا اسی روز دارالسلطنت کی پیاسی دھرتی
پیاس سے مجبور ہو کر چیخ اٹھی اور سورماؤں نے اس چیخ سے متاثر ہو کر فوراً کانفرنس اور
ایشیائی ممالک کے اہم مسائل کو نظر انداز کر کے دھرتی کی پیاس بجھا دی۔ ہندوستان
کی دھرتی پر خون کے سرخ سرخ بڑے بڑے دھبے بیحد خوبصورت معلوم ہوتے ہیں
بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بہت سے لال لال جھنڈے سڑکوں پر پھاڑ کر پھینک
دیئے گئے ہوں۔ اب۔ اس لال جھنڈے کا ذکر آگیا ہے تو اس کے بارے میں بھی
سن لیجئے۔ ہندوستان میں اس جھنڈے کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔
ہندوستانیوں کی ایک معزز اکثریت اسے سرنگوں کرنا چاہتی ہے مگر اس
جھنڈے کے رکھوالے اس کی جان سے زیادہ حفاظت کرتے ہیں۔ مجبوراً خون کو جھنڈوں ۱۵۸
کی صورت میں پھیلا پھیلا کر یہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کرتے ہیں ان سرخ جھنڈوں
سے دشمنی کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ جھنڈے ہندوستان میں پھر سے انسانیت کو زندہ
کرنا چاہتے ہیں یہ سرمایہ داری کے ایوانوں کو ڈھانے کی فکر میں ہیں اگر کہیں یہ
سرخ جھنڈے ہندوستان کے کونے کونے میں لہرا گئے تو انسانیت زندہ ہو جائیگی
اور نتیجہ میں پیاسی دھرتی ہمیشہ تشنگی محسوس کرتی رہیگی۔ مہان بھی ان جھنڈوں سے بیحد
گھبراتا ہے اگر کہیں یہ سربلند ہوئے تو مہان بھی ——
—— برہنائے تنفر ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیگا اور
پھر اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان کے خواب شرمندہ تکمیل نہیں ہو سکیں گے ہندوستان
میں انسانوں کی اکثریت ہو جائیگی درندوں کو یہ انسان ہلاک کر دینگے آئین الانسانیتکی

اژدا لیکر ان کو گولی مار دینگے اور یہ جدید نظریہ غلط ثابت ہو جائیگا کہ انسان پہلے درندہ تھا جونک اور کھٹمل جنکو مل مالک یہ سرمایہ دار کہا جاتا ہے انکی نسل صفحہ ہستی سے مٹ جائیگی اور پھر ماتر بھومی !۔ ماں ! — ہمیشہ پیاسی رہیگی۔ سعادت مند لڑکے اپنی ماں کو پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔ غلامی جیسے حسین لفظ کو ہندوستانی لغت سے خارج کرنے کی فکر میں ہیں اس لئے ان جھنڈوں کو سرنگوں کر دو ان کو مٹی میں ملا دو مزدوروں کے خون سے رنگے ہوئے ان سرخ جھنڈوں کی ہندوستان کو ضرورت نہیں۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی یہ جھنڈے مضرت رساں ہیں۔ یہ ہندوستان کے ایک باعزت پیشہ "قیادت" کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں چند پیٹ بھروں کو بھی یہ بھوکے بھوکا مارنا چاہتے ہیں اور ان کے بعد بھی ان فاقہ مستوں کا ادعا یہ ہے کہ اس سرخ جھنڈے کی مدد سے یہ سارے ہندوستان کی بھوک کا مسئلہ حل کر دینگے ١٥٩
یہ صرف ڈھکوسلا ہے ! — ایک فریب ہے۔ ان کی اس — چال کو ٹاٹا۔ برلا اور ڈالمیا خوب سمجھتے ہیں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ یہ سرخ جھنڈے والے انسان کے دشمن ہیں یہ روحانی ملک سے روحانیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو انکی باتوں میں نہیں آنا چاہئے۔ سعادت مندی کا تقاضہ صرف یہ نہیں ہے کہ ماں کی پیاس کو دور کیا جائے خواہ وہ بھائی کے خون ہی سے کیوں نہ دور ہو۔ نسل انسانی کے محسن ہابیل و قابیل کے واقعہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کوروں پانڈوں کی عدیم المثال برادرانہ اخوت کو نہیں بھلایا جا سکتا۔ میر جعفر جیسے وفادار کی وفاداری سے ازلی غلاموں کو سبق لینا ضروری ہو ڈڑوا اوڑوں کی قائم کی ہوئی ریت کو نہیں توڑا جا سکتا اُسے نباہنا ہی پڑے گا۔

کیونکہ وضعداری اسی کا نام ہے ہندوستان وضعدار ملک ہے۔ ا۔ وہ کبھی بھی اپنی اس خصوصیت پر حرف نہیں آنے دیگا۔ دھرتی کی پیاس کو بجھانے سے نہیں روکا جا سکتا وہ ضرور بجھائی جائیگی۔

مجھے افسوس ہے کہ اس معاملہ میں ایشیا کے دوسرے ممالک بہت پیچھے ہیں ان کے یہاں ابھی درندے پیدا نہیں ہو سکے۔ ہم اس سلسلہ میں ہندوستان سے رہنمائی چاہتے ہیں۔ تاکہ ہمارے ملک کے سادے نقشوں پر بھی خون کے دھبوں کی ایسی ہی حسین بیل کاری ہو جائے۔ اور غرب اور شرق میں ہماری بہادری کا ڈنکا بھی پٹ جائے۔ اور ہم بھی اپنی ماں کی پیاس کو اپنے بھائیوں کے خون سے بجھا سکیں۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستان کے قائدین اس سلسلہ میں ہماری مدد ضرور کرینگے۔ مجھے آج بڑی خوشی ہے کہ میں اس پیاسی دھرتی کے اس دارالسلطنت میں موجود ہو کر اپنے ان تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں۔

رئیس امروہوی

شاباش اے ہندوستان

لب پہ آزادی کے نعرے دل پہ محکومی نہاں
امن عالم کی تمنا اور جارحانہ جنگیاں
دوش پر خدمت کا پرچم آستیں میں بجلیاں
کیا یونہی ہوتی ہیں قومیں سربلند و کامراں
شاباش اے ہندوستاں شاباش اے ہندوستاں

کیا یہی ہے امن و آزادی کا عہد خوشگوار
اے نوا کھالی بتا! کچھ بول اے ارض بہار؟
کیا یہی وہ عہد ہے اے انقلاب روزگار؟
جس کی خاطر مرمٹے تھے انقلابی نوجواں
شاباش اے ہندوستاں، شاباش اے ہندوستاں

خونی ہے ہندوستان

خانہ جنگی کا جہنم ہے وطن کی سرزمیں
کیا یہی ہے خواب آزادی کی تعبیرِ حسیں
آج ہم سے کہہ رہے ہیں سامراجی نکتہ چیں
حُرّیت کا تم اٹھا سکتے نہیں بارِ گراں
باش اے ہندوستاں شاباش اے ہندوستاں

قوم کے باغی جوانوں نے بہ اُمیدِ ظفر
جان دی تھی کیا اسی ہندوستان کے نا
کیا یہی ہے شامِ محکومی کی تابندہ سحر
کیا یہی ہے عہدِ آزادی کا جبال پر سماں
باش اے ہندوستاں شاباش اے ہندوستاں

اپنے ہاتھوں اپنے لاکھوں بھائیوں کا قتلِ عا
اے غلام آبادِ ہند اے ارضِ محکوم و غلا
وقت لے گا تجھ سے تیری سرکشی کا انتقا
موت شرمائے گی سن کر تیری خونیں داستا
باش اے ہندوستاں شاباش اے ہندوستاں

ہاجرہ تنویر

اور خون مل گیا

پنڈت خوشحالی رام کو چاند نگر میں رہتے دس برس گذر چکے تھے کسی کو بھی ۱۶۳
لوم نہ تھا کہ پنڈت جی کہاں کے رہنے والے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ اس
شروع شروع میں اُن کے ساتھ بڑی بے اعتنائی برتی گئی مگر پنڈت جی نے
کی کوئی پرواہ نہیں کی اور مزے سے جامن والے مندر میں ڈیرہ جما کر پوجا پاٹ
ع کردی چنانچہ چند ہی ماہ بعد انکی یہ ریاضت رنگ لائی اور رفتہ رفتہ گاؤں والوں
ان سے میل جول بڑھا لیا اور دو سال بعد تو ان کا حلقہ اثر اسقدر وسیع ہو گیا کہ
پاس کے دیہات میں بھی ان کے عقیدت مند پیدا ہو گئے اور عقیدت مندوں
روز افزوں ترقی نے پنڈت جی کے جسم کی وسعت پر بھی کافی اثر ڈالا۔ منہ پر پانی آنے
ساتھ ساتھ ان کی توند بھی کافی تیزی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی یوں تو پنڈت جی کا
ے گاؤں پر اثر تھا مگر تعجب والی بات تو یہ تھی کہ مرزا مجید جیسا بکٹ تھانیدار بھی

نہ صرف ان کا خاص لحاظ و احترام ملحوظ رکھتا تھا بلکہ پنڈت جی سے گھنٹوں باتیں کیا کرتا۔ سادہ لوح دیہاتی اسے بھی پنڈت جی کا روحانی تصرف سمجھتے کیونکہ مرزا مجید قد جلاد مشہور تھا کہ اس سے بڑے بڑے بدمعاش کانپتے تھا علاقہ کا شاید ہی کوئی گاؤں بچا ہو جہاں اُسنے دست درازی نہ کی ہو وہ صرف روپیہ ہی قبول نہ کرتا بلکہ گھی اور اناج کے لئے بھی بلا تکلف کہہ دیتا اور جب کبھی کوئی الہڑ دوشیزہ اس کی نظر چڑھ جاتی تو وہ اس وقت تک نظر سے نہیں اترتی۔ جب تک کہ اس کی دوشیزگی کی آب نہ اتر جاتی - پورے علاقہ میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے حکم کی تعمیل سے گریز کرے۔ کیونکہ عدم تعمیل کے جواب میں ایسے گستاخ کے ہاتھوں میں دوسرے روز سویرے ہتھکڑیاں پڑ جاتیں۔

۱۶۴ جبھی تو امجد جان پنساری، نتھو حلوائی۔ اور مینا گوالہ اپنی بہن، بیوی اور لڑکی کی عصمت بچانے کے جرم میں تین سال کی قید بامشقت بھگت رہے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے باوجود زینت، روپا اور لیلاوتی کو مرزا مجید کی خواہشات پر اپنی جوانیاں نثار کرنا پڑیں اور سال پورا ہونے سے پہلے زینت نے کنوئیں میں گر کر جان دیدی روپا سنا ہے شہر بھاگ گئی کھلے بندوں ہر کسی کے ہاتھ آرہی ہے اور لیلاوتی ایک موٹے تازے لڑکے کو لئے آج بھی گاؤں سے باہر ایک جھونپڑی میں پڑی رہتی ہے گاؤں والوں کے نکال دینے کے باوجود اُسے کچھ غرور ہے شاید یہ غرور ہو کہ وہ ایک تھانیدار کی بیوی رہ چکی ہے خواہ ایک دو ہفتہ ہی کیوں نہ رہی ہو یا وہ اس پر گھمنڈ کرتی ہے کہ تھانہ دار کی بیوی نہ سہی تو تھانیدار کے لڑکے کی ماں تو ہے بہرحال کچھ بھی ہو تھانیدار مجید اگر پورے علاقہ میں کسی سے جھک کر ملتا تھا تو وہ پنڈت جی تھے اور ان کی عقیدت میں اس

روز سے تو اور بھی اضافہ ہوگیا تھا جب الو دادا کے لڑکے زبیر نے جو شہر سے پڑھ کر آیا تھا ایک پنچایت کر کے سبکو یہ قسم دینے کی کوشش کی تھی کہ ہم سب ملکر رہینگے اگر کسی پر کوئی ظلم ہوگا تو سب ملکر اس کا مقابلہ کرینگے۔ سرکاری افسروں کو رشوت نہیں دینگے۔ بیگار میں گاؤں کا کوئی آدمی کسی کا کام نہیں کریگا۔ مگر پنڈت جی نے فوراً سب گاؤں والوں کو یہ کہکر اس سر پھرے لڑکے کی باتوں میں نہیں آنے دیا کہ بالک مورکھ ہے حاکم سے دب کر ہی رہنا ہمارا دھرم ہے کیونکہ حاکم بھی پرماتما کے سمان ہوتے ہیں جو حاکم کا مقابلہ کرتا ہے اس کا دھرم بھرسٹ ہو جاتا ہے۔ ایشور ہی تو حاکم بناتا ہے۔ جس کو ایشور چاہتا ہے چھوٹا یا بڑا بنا دیتا ہے۔ اس طرح کی باتوں کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم ایشور کے کاموں میں دخل دیں اور پنڈت جی کی یہ باتیں سب کی سمجھ میں آگئیں اور کسی ایک نے بھی قسم نہیں کھائی البتہ دتا سمیو۔ ہری کا لڑکا سلیم اس کی باتوں میں ضرور آگیا تھا۔ ۱۴۷

کچھ دن سے شہر سے خبریں آرہی تھیں کہ وہاں فساد ہوگیا۔ سیکڑوں لاشیں سڑکوں پر پڑی ہوئی ہندوستان کی اس رواداری کا منھ چڑھا رہی ہیں جس پر اکبر اعظم کو ناز تھا اور گاؤں والے حیران تھے کہ آخر شہر والے لڑتے کیوں ہیں مگر ان کے چھوٹے چھوٹے دماغ اس کو نہ سمجھ سکے مگر بیچارے پنڈت جی سے گاؤں والوں کی یہ مصیبت نہیں دیکھی گئی اور آخر ایک روز انھوں نے گاؤں کے ہندوؤں کو مندر میں جمع کر کے صاف کہدیا۔ کہ اس لڑائی کی اصلی وجہ یہ ہے کہ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ان کا ملک ان سے چھین لیں گاؤں کے تمام ہندو کاشتکاروں کو بیدخل کر کے ان کی زمینوں پر قبضہ کرلیں اور جب للو دادا کے لڑکے زبیر نے کھڑے ہو کر پنڈت جی سے یہ سوال کیا کہ آخر مسلمان ایسا کیوں چاہتے ہیں آجتک تو کبھی ایسا ہوا نہیں تھا تو پنڈت جی اس سوال کو سنکر سٹپٹا گئے اور ان کو جواب دیتے

نہ بن پڑا اور وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ تم ابھی مورکھ ہو تم کیا جانو ان باتوں کو۔ اور جب یہ مورکھ
بالک چپ چاپ یہاں سے نکل کر گاؤں کے تمام مسلمانوں کو مندر میں یہ کہہ کر لے آیا
کہ تم سب چلکر اس کا جواب دو کہ کیا تم واقعی ایسا چاہتے ہو تو پنڈت جی اس پر برس
پڑے۔ اور انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ مسلمانوں کو مندر میں لاکر اس نے مندر
کی توہین کی گاؤں کے مسلمان یہ سنکر بیحد رنجیدہ ہوئے اور فوراً واپس چلے آئے اور
اس طرح سے برسوں کے پرانے تعلقات میں ہلکا سا تناؤ پیدا ہو گیا۔ شاید اسی
تناؤ کا نتیجہ تھا کہ چودھری کاسم نے اب کے پہلی مرتبہ میلاد شریف کی محفل میں گاؤں
کے ہندوؤں کو نہ بلایا گاؤں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا ورنہ اس سے پہلے تھا اور
میلاد میں ہمیشہ دونوں فرقے شریک ہوا کرتے تھے۔ چودھری کے لڑکے کو یہ بہت برا
۱۶۶ معلوم ہوا اور اس نے آخر اپنے باپ سے کہہ ہی دیا کہ بابا یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مگر
چودھری نے بغیر کسی ناگواری کے صاف صاف کہہ دیا کہ ان کا مندر اگر ہمارے جانے
سے ناپاک ہوجاتا ہے تو ہماری محفل بھی اُن کے آنے سے گندی ہو جاتی ہے اور
تم نے سُنا نہیں کہ یہ مولوی صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ ہندو کافر ہیں یہ جہنم میں جائیں گے
سلیم اس جواب کو سنکر کچھ رنجیدہ ہو گیا پھر بھی اس نے زبیر سے یہ کل حال بیان کرکے
اس معاملہ میں اس سے مدد لینا چاہی اور جب زبیر نے اسے یہ بتایا کہ پنڈت جی
اور مولوی صاحب اپنی روٹیاں سیدھی کرنے کو ایسی باتیں کہتے ہیں تو اس کا دل چاہا
کہ وہ ان مولوی صاحب اور پنڈت جی کو خوب مارے مگر زبیر کے سمجھانے بجھانے
پر اس نے اپنے ارادہ کو ملتوی کر دیا۔ شہر سے فساد کے بڑھنے کی خبریں برابر گاؤں میں
آرہی تھیں اور پنڈت جی برابر گاؤں والوں کو ہوشیار کر رہے تھے کہ وہ مسلمانوں سے

بگڑ رہی لیکن اس کے باوجود تھانیدار مرزا مجید کی بیٹھک پنڈت جی کے پاس برابر جاری تھی اور کئی دن سے تو تھانیدار نے مسلسل پنڈت جی کے پاس آنا شروع کر دیا تھا لوگوں کو تعجب بھی تھا کہ چار کوس کا فاصلہ طے کر کے آخر تھانیدار روز پنڈت جی کے پاس کیوں آرہا ہے مگر پنڈت جی نے یہ کہکر لوگوں کو مطمئن کر دیا کہ فساد کی وجہ سے سرکار نے تھانیدار کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے آس پاس کے گاؤں میں روز پھیرا کرے۔ تھانہ دار کی آمد اسی طرح برابر جاری رہی اور ایک روز تو تھانیدار رات کے دو بجے تک پنڈت جی کے پاس بیٹھا رہا مگر اس ہی رات نہ صرف رام لال کی جوان لڑکی کانتی ہی غایب ہو گئی بلکہ چودھری قاسم کے لڑکے سلیم کا بھی پتہ نہ چلا — صبح اس خبر کے پھیلتے ہی سارے گاؤں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور پنڈت جی کے یہ کہنے پر کہ انھوں نے صبح کے وقت سلیم اور کانتی کی آوازیں سنی تھیں لوگوں کو یہ یقین آگیا کہ سلیم کانتی کو بھگا کر لیگیا ۱۷۱
— اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد پنڈت جی نے یہ خبر بھی سنائی کہ شہر میں مسلمان ہندو دیویوں کو خراب کر رہے ہیں ان کو دھرم بدلنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یہ سن کر تو پورا مجمع بے قابو ہو گیا اور چودھری قاسم سے اس کا بدلہ لینے کے لئے باوجود پنڈت جی کے منع کرنے کے دوڑ پڑا — چودھری قاسم کے قسمیں کھانے کے باوجود مشتعل مجمع کو یقین نہ آیا اور اس کے گھر کو آگ لگا دی اور جب چودھری قاسم کے چیخنے چلانے پر آس پاس کے مسلمان چودھری کی مدد کو دوڑے تو باقاعدہ لاٹھیاں چلنے لگیں۔ دونوں قوموں کے سورما بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ کراہیں۔ اور چیخیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں کتنے ہی نوجوان کٹے ہوئے

درختوں کی طرح زمین پر پڑے گاؤں کی باہمی رواداری کا مذاق اڑا رہے تھے۔ عورتیں گھروں کے دروازے بند کرکے آہ و بکا میں مصروف تھیں لڑائی صرف لاٹھیوں ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ درانتی اور گنڈاسے بھی پوری بیدردی سے استعمال ہو رہے تھے گیہوں کی بالیں کاٹنے کے بجائے آج اُن سے پہلی مرتبہ انسانوں کے سر کاٹنے کا کام لیا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں کبتک یہ لڑائی جاری رہتی کہ یکایک کانتی کی آمد نے سب کو حیرت میں ڈال دیا اور جب کانتی نے دور ہی سے چیخنا شروع کیا کہ سلیم بھیا زخمی ہو گئے۔ ان کو تھانیدار نے ادھ مرا کر دیا ہے تو فضا میں اٹھی ہوئی لاٹھیاں خود بہ خود جھک گئیں درانتیاں اور گنڈاسے ہاتھوں سے چھوٹ پڑے۔ کانتی نے جب زمین کو خون سے لالہ زار دیکھا تو وہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ بڑی
۱۶۸ کوششوں کے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے بتایا کہ پنڈت جی نے رات کو آ کر پہلے تو اُسکے پتاجی کو پکارا اور جب اس نے ان کو بتایا کہ وہ صبح سے بیگار میں تھانہ گئے ہوئے ہیں تو پنڈت جی یہ کہہ کر اُسے باہر بلا لائے کہ وہ مندر کے پاس پڑا ہوا ہے اُسے کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے گھبرا کر اُن کے ساتھ ہو گئی اور جب وہ مندر پہنچی تو تھانیدار نے پنڈت جی کی مدد سے اُسے گھوڑے پر زبردستی بٹھا کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی وہ چیختی چلاتی رہی مگر کسی نے اُسکی آواز نہ سُنی چودھری قاسم کا کھیت جو گاؤں سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے راستہ ہی میں پڑتا ہے کانتی کی آواز سُن کر سلیم جو کھیت کی رکھوالی کر رہا تھا اس کے پیچھے لپکا مگر گھوڑے اور آدمی کی چال میں بڑا فرق ہے آخر کئی میل دوڑنے کے بعد سلیم اس تک پہنچ پایا تھانہ دار سلیم کی اس مداخلت پر بہت چراغ پا ہوا اور اپنا ہنٹر لیکر اس کی طرف

برمھا دونوں گتھم گتھا ہو گئے کانتی موقع پاکر ایک جھاڑی میں چھپ گئی ایک گھنٹہ کی
مسلسل کوشش کے بعد تھانیدار نے سلیم پر قابو پا لیا اور اپنی سنگینوں کے کندے
سے زخمی کر کے فرار ہو گیا ۔ وہ رات بھر زخمی سلیم کے پاس بیٹھی رہی صبح جب
اُسے ہوش آگیا تو قریب کے گاؤں کے ایک کھیت میں اسے بٹھا کر یہاں مدد لینے
دوڑ پڑی ۔۔۔ اور یہ کہتے کہتے اس نے سامنے پڑے ہوئے قاسم چودھری کا خون
اپنے ماتھے پر مل لیا اور چیخ چیخ کر رونے لگی ۔ اس واقعہ نے ہندو مسلمان
دونوں کی آنکھیں کھول دیں اور تیزی سے مندر کی طرف لپکے مگر مندر خالی تھا
البتہ زبیر رسیوں سے بندھا ہوا ضرور پڑا تھا اور کسی ظالم نے منھ میں بھی کپڑا ٹھونس
دیا تھا تاکہ وہ اپنی مدد کے لئے کسی کو نہ بلا سکے ۔۔۔ اور جب زبیر نے اُن کو بتایا
کہ رات اُس نے پنڈت جی اور تھانیدار کی سازش سُنکر پنڈت جی کو ڈانٹا ۷۹
تو دونوں نے ملکر اسکی یہ درگت بنائی ۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جس وقت پنڈت جی
باہر بیٹھے ہوئے یہ منگھڑت واقعات سُنا رہے تھے وہ یہاں اصل بات بتانے کے
لئے ترس رہا تھا لوگوں کے استفسار پر وہ صرف اتنا بتا سکا کہ جب گاؤں میں
فساد زیادہ بڑھا تو پنڈت جی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ میں پولیس کو اطلاع
دینے جا رہا ہوں ۔۔۔ اور پھر یہ پورا مجمع زبیر کی سرکردگی میں اس جگہ واپس آیا
جہاں تازہ تازہ خون ابھی تک بہہ رہا تھا اور زبیر نے بغیر کچھ کہے سُنے یکایک
اس خون میں ہاتھ رنگ کر اپنے ماتھے پر تلک کا ایک نشان لگا لیا تھا اور
دیکھتے ہی دیکھتے تمام ہندو مسلمانوں کی پیشانی پر اس مقدس خون کا تلک لگ گیا
کانتی بھی اس موقع پر خاموش نہیں رہی بلکہ یہ کہتے ہوئے کہ ہندو مسلمانوں کے ملے جلے

خون کی بندی لگانا میرا بھی دھرم ہے اس نے اپنی معصوم پیشانی پر ایک چھوٹا سا نشان اس خون سے بنا لیا اور زبیر برابر کہتا رہا کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں اگر بھائی بھائی نہ ہوتے تو اُن کا خون بھی آپس میں نہ ملتا یہ دیکھو مرنے کے بعد بھی ان میں کیسی یگانگت ہے دونوں کا خون آپس میں اس طرح مل گیا ہے کہ اب اسکو کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی الگ نہیں کر سکتا — کہو چیخ چیخ کر کہو۔

ہندو مسلم بھائی بھائی

اور ان بلند نعروں سے پوری فضا گونج اٹھی مگر گونج ختم ہونے سے پہلے ہی پولیس کے سیکڑوں نوجوانوں نے بندوقیں تان تان کر پورے مجمع کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

اور کانتی نے دیکھا کہ اس کا اپنا بھائی بھائی سلیم بھی ہتھکڑیوں میں جکڑا ١٧٠
ہوا ایک طرف کھڑا مسکرا رہا تھا اور جب کانتی نے چیخ مار کر یہ کہا کہ بھیا مجھ ابھاگن کے کارن یہ سب کچھ ہوا میری ہی کارن قاسم چودھری مارے گئے تو بھی اُسکے چہرے پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی — اور دوسری طرف پنڈت جی گاؤں والوں کی نظریں اپنی طرف پڑتی دیکھ کر بھی بدستور ہنس ہنس کر تھانیدار سے باتیں کر رہے تھے۔

اور ہتھکڑیوں کی جھنجھناہٹ سے ایک عجیب نغمہ

"تیسری طاقت"

آپ ہی پیدا ہو رہا تھا —

"تیسری طاقت"

یکتاؔ امروہوی !

اندیشہ

مادرِ ہند، مِہرباں نہ رو، دیکھ نہ رو
تیری اِن آنکھوں سے یہ اشک نہیں بہتے ہیں
بلکہ بہتا ہے، بہا جاتا ہے آنسو بن کر
ایسا امرت ترا، ہم رعب جسے کہتے ہیں

خود کو بے بس نہ بنا اپنا تدبر مت کھو
ورنہ یہ ہندو مسلمان، یہ تیری اولاد
ختم لڑ لڑ کے اسی طرح سے ہو جائیں گے
رات دن ہوتا رہیگا یونہی خونریز فساد

شک نہیں اس میں تجھے رنج ہی خونریزی کا
کیسی اولاد ہے آپس میں کٹی مرتی ہے ؟

بھائی کے بھائی چھرا گھونپنے کے خوش ہوتا ہو
ہو تعجب تو انھیں عاق نہیں کرتی ہے

اپنی اولاد انھیں کہنا ہو توہین تری
کیسی منحوس گھڑی ان کو جنا تھا تو نے
اس سے اچھا تو یہی تھا کہ نہ جنتی ان کو
اس سے پہلے بھی کبھی غم یہ سہا تھا تو نے؟

سیکڑوں کا شوق کرنا پڑا ماتم تجھ کو
غم فسادوں سے اٹھائے ہیں بہت ہی تو نے
تیری حالت پہ بہت مجھکو ترس آتا ہو
داغ اولاد کے کھائے ہیں بہت ہی تجھ نے ۱۷۳

لیکن اس غم کے یہ معنی نہیں تو روتی ہے
اور روتی ہے روتی بھی ہے زار و قطار
مجھکو یہ خوف ہو خطرہ ہو اندیشہ ہو
کہیں بالکل ہی نہ جاتا رہے یہ تیرا وقار

مادرِ ہند! کہا مان نہ رو دیکھ نہ رو

زیرِ طبع

"سوختیات"

کے بعد

اس چوتھے مجموعہ

"پیچ و خم"

کے افسانوں کو پڑھ کر آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان ۱۷۳

کے جلیل القدر ترقی پسند فنکار ادیب رومان

سلمان الارشد فاروقی

نے محبت کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں یہ دوسری مرتبہ

اک ایسی زغند لگائی ہے جس میں جھجک کا نام نہیں

آرٹسٹک رنگین ڈسٹ کور معیاری کتابت وطباعت قیمت عہ/ ۱۲ آ

گہوارۂ ادب فیاض گنج بہادر گڈھ روڈ دہلی

(زیر ترتیب)

ہندوستان کی مشہور ترقی پسند شاعرہ

مہاجرہ تنویر

پہلی خاتون ہے جس نے قطعات کہنے میں ملکہ حاصل کیا ہے اس کے

قطعات مردوں کی خانگی لغزشوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں

"تراشے"

اس کے ان ہی قطعات کا مجموعہ ہے۔ زیادہ تر اس کے 176
پیش نظر عورت کی مظلومیت ہے یہ مردوں کے معاشرتی مظالم
کو ختم کر کے عورت کی انفرادیت تسلیم کرانے پر تلی ہوئی ہے اور اس
کے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک اس کا یہ مقصد پورا نہ ہو جائے گا۔
یہ اپنے بیباک قلم کو نہیں روکے گی۔

ملنے کا پتہ

گہوارہ ادب فیاض گنج بہادر گڈھ روڈ دہلی